بسم اللہ الرحمن الرحیم

محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید کے کارنامے

پُراسرار اغوا

اشتیاق احمد

www.urdukorner.com

دو باتیں

السلام علیکم!

سوچ رہا ہوں، پانچویں خاص نمبر کی دو باتیں کیا لکھوں، کتنی لمبی لکھوں، جس انداز کا یہ خاص نمبر ہے، اس انداز کا کوئی خاص نمبر پہلے آپ کی خدمت میں پیش نہیں کیا گیا۔

سب سے پہلا خاص نمبر تقریباً ساڑھے تین سو صفحات کا تھا اور ایک ہی جلد میں تھا۔ دوسرا خاص نمبر چار سو سے زائد صفحات پر مشتمل تھا اور ایک ہی جلد میں تھا، لیکن اس کی جلد بندی نے بڑی رکاوٹیں پیدا کیں۔ جلدیں اکھڑ اکھڑ گئیں، لہٰذا فیصلہ یہ کیا گیا کہ چوتھا خاص نمبر دو حصوں میں تقسیم کر کے آپ تک پہنچایا جائے، تاکہ جلدیں نہ اکھڑیں۔ اسی طرح کالا شیطان اور شیطان کے پجاری دو حصوں میں تقریباً آٹھ سو صفحات پر مشتمل آپ کو ملا۔ یہ خاص نمبر شروع کرنے سے پہلے میں فکر میں غرق تھا کہ کیا کروں، اسے کتنے صفحات کا اور کتنی جلدوں میں بناؤں۔ بے شمار پڑھنے والوں کا اصرار یہ تھا کہ خاص نمبر اتنے موٹے نہیں ہونے چاہئیں، واقعات یاد نہیں رہتے۔ کچھ کا کہنا یہ تھا کہ پانچواں خاص نمبر ایک ہزار سے کم صفحات کا نہیں ہونا چاہیے۔ کچھ لکھتے تھے کہ خاص نمبر ہماری قوت خرید سے باہر ہیں یا والدین خرید کر نہیں دے سکتے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان سب حالات میں گھرنے کے بعد میں نے بھی دو باتیں سوچیں، آپ کے لیے نہیں، اپنے لیے۔ پہلی تو یہ کہ خاص نمبروں کا سلسلہ ہی بند کر دیا جائے، اور ہر ماہ باقاعدگی سے عام نمبر ہی پیش کیے جاتے رہیں، لیکن پھر اپنے تمام پڑھنے والوں کے جذبات میرے سامنے آ کھڑے ہوئے جو خاص نمبر کا انتظار چھ ماہ تک کرتے ہیں۔ آخر میں نے دوسری بات سوچی۔ یہ بات نئی بھی تھی، عجیب بھی، اور خوشگوار بھی۔ تمام اعتراضات اور خواہشات کا جواب بھی۔ لہٰذا پانچواں خاص نمبر اسی سوچی گئی بات کے تحت آپ تک پیش کیا جا رہا ہے۔

یہ چار حصوں پر مشتمل ہوگا۔ ہر حصہ عام ناول جتنا ہی ہوگا۔ ہر حصے کی قیمت عام ناول کے برابر ہی ہوگی، لیکن اس کی کہانی ایک ہوگی۔ آپ کے لیے یہ آسانی بھی ہوگی کہ ایک وقت میں ایک حصہ خرید کر پڑھ سکتے ہیں، پھر دوسرا، تیسرا اور چوتھا خرید کر اپنا شوق پورا کر سکتے ہیں۔ یعنی آپ کو یک مشت پورا خاص نمبر خریدنے کی فکر نہیں ہوگی۔ ان چاروں حصوں کے صفحات بھی تقریباً تقریباً عام نمبروں کے برابر ہی ہوں گے۔ آپ ترتیب کا خیال رکھیں۔ یہ نہ ہو کہ کوئی حصہ خریدا اور پڑھنا شروع کر دیا اور پھر گالیوں بھرا خط مجھے لکھنے بیٹھ گئے، جیسا کہ پُراسرار مجرم اور خونی کیمپ کے سلسلے میں ہوا۔ آپ ہمیشہ ہی میرے ناول ترتیب سے پڑھنے کی کوشش کیا کریں۔ جو ناول پہلے نمبر پر ہے، اسے پہلے ہی پڑھیں، چاہے وہ ایک دوسرے کا حصہ نہ بھی ہوں۔ اس طرح آپ کبھی جھلاہٹ کا شکار نہیں ہوں گے۔ انگارے چبانے سے بھی بال بال بچ جائیں گے اور پھر آپ کو گالیوں بھرا خط لکھنے کی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔ آج کل عام رواج ہے، گالیوں بھرا خط لکھا، دل کی بھڑاس نکال لی، کیونکہ دوسرا سامنے تو ہوتا نہیں۔ خوف بھی نہیں ہوتا کہ دوسرا منہ نوچ لے گا، لیکن میں آپ کو اس عادت سے نجات دلانا چاہتا ہوں۔ اب یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگوں کی عادت ہی بن جاتی ہے، ایسے خطوط لکھنے کی۔

اب ہو جائیں خاص نمبر کے بارے میں دو باتیں۔ پہلا حصہ پُراسرار اغوا آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ کردار آپ کو چالاک دشمن کے اشاروں پر ناچتے نظر آئیں گے، بے بس بھی نظر آئیں گے، حیران اور پریشان بھی، لیکن آپ دیکھیں گے کہ مایوسی پھر بھی ان کے پاس نہیں پھٹکی۔ اپنے اوسان ان حالات میں بھی وہ بحال رکھے ہوئے ہیں۔ ناول کے

www.urdukorner.com

آخری صفحات تک پہنچتے ہی آپ اگلے حصے کے لیے بے چین ہو جائیں گے۔ آپ خود کو بھی کرداروں کے ساتھ ان حالات میں گھرا محسوس کریں گے۔ اگر ایسا ہوا تو پھر خیال کیجیے گا کہ میں نے یہ ناول لکھ کر جھک ماری ہے۔ یوں جھک مارنا بھی کبھی کبھی صحت کے لیے بہتر ہوتا ہے۔ میں نے بہت سے لوگوں کو جھک مار کر صحت بناتے دیکھا ہے۔ مجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا اور وہی تنگ منگ سا اور دھان پان سا ہوں۔

یہ دو باتیں اگر آپ کو خشک محسوس ہوں تو پروا کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ ان دنوں موسم بھی تو بہت خشک ہے، بلا کی گرمی پڑ رہی ہے، ان حالات میں تر باتیں کہاں سے لاؤں ہاں، ناول میں کردار ضرور آپ کو تر باتیں کرتے نظر آئیں گے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میرے کردار موسم اور حالات کا اتنا اثر نہیں لیتے، انھوں نے آنکھ ہی ایسے حالات میں کھولی ہے۔

اب آپ کہیں گے، وحشت تیرے کی۔ یہ تھیں باتیں پانچویں خاص نمبر کی، بہت شور سنتے تھے جس کا، جو پڑھیں تو چوں چوں کا مربہ نکلیں، تو جناب ایسی کوئی بات نہیں۔ اس بار ہر حصے سے پہلے آپ کو دو باتیں ضرور ملیں گی۔ رہی سہی کسر ان میں پوری کرنے کی کوشش کروں گا اور کوشش کا کیا ہے، ناکام بھی ہو سکتی ہے۔ آخر آپ اتنا کیوں نہیں سمجھتے۔ ہر انسان کی ہر کوشش کامیاب ہونے لگے تو وہ تو گیا کام سے۔ میں فی الحال کام سے نہیں جانا چاہتا۔ بس یہی وجہ ہے کہ ہلکے پھلکے، چٹ پٹے، مزے دار، ہنگامہ خیز اور کبھی ڈھیلے ڈھالے ناول آپ کی خدمت میں پیش کرتا رہتا ہوں۔ اگر ہر ناول شاہکار سے شاہکار بنانے کے چکر میں پڑ گیا تو ان کا وہی حشر ہوگا جو پنجابی فلموں کا۔

میں دور نکل گیا، حالانکہ دور تو اس مرتبہ صرف کرداروں کو نکلنا ہے۔ مجھے تو یہیں ہی لوٹ آنا چاہیے۔ آخر باقی تین حصے بھی تو لکھنے ہیں۔ یہ دو باتیں جیسی بھی ہیں، انہیں قبول کیجیے۔ یہی درویش کی صدا ہے۔

اشتیاق احمد

عجیب بے مروت لوگ

آئی جی شیخ نثار احمد کا چپراسی انسپکٹر جمشید کے دفتر میں داخل ہوا۔ انسپکٹر جمشید اس وقت ایک فائل میں گم تھے۔ اکرام اپنی میز پر مصروف تھا۔ دونوں کو اس کے اندر داخل ہونے کا پتا نہ چلا۔ آخر اس نے کھنکار کر کہا:

"سر، شیخ صاحب آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔"

"اوہ، اچھا۔" انھوں نے چونک کر سر اوپر اٹھایا: "کیا ان سے کوئی صاحب ملنے آئے ہیں؟"

"جی نہیں، البتہ ابھی ابھی ایک فون آیا تھا۔"

"ٹھیک ہے، تم چلو میں آ رہا ہوں۔" وہ بولے۔ چپراسی کے نکلتے ہی انھوں نے اکرام سے کہا:

"میرا خیال ہے، آئی جی صاحب نے بہت ہی خاص کام کے لیے بلایا ہے۔"

"آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

"اس طرح کہ صبح سویرے دس بجے سے پہلے وہ مجھے کبھی نہیں بلاتے۔ یہ ہم سب کا دفتری کام کا وقت ہوتا ہے۔ سبھی اپنا اپنا دفتری کام کاج نمٹانے کی فکر میں ہوتے ہیں۔"

''جی ہاں، بات تو ٹھیک ہے۔''

''شاید میں آج واپس اپنے دفتر میں بھی نہ آسکوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گھر فون کرنے کی بھی مہلت نہ ملے، لہٰذا میں پونے پانچ بجے تک نہ لوٹوں تو گھر فون کر دینا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

''آپ تو مجھے ڈرائے دے رہے ہیں۔''

''میں تمہیں ڈرا نہیں رہا، اپنے اندازے بیان کر رہا ہوں، جو غلط بھی ہو سکتے ہیں۔'' انہوں نے کمرے کے دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں نے تو آج تک دیکھا نہیں کہ کبھی آپ کے اندازے غلط ہوئے ہوں۔''

''یہ اللہ کی مہربانی ہے۔'' انہوں نے کہا اور پھر خدا حافظ کہتے ہوئے باہر نکل گئے۔

''خدا حافظ۔'' اکرام کے منہ سے نکلا اور اسے یوں لگا، جیسے اس کا دل کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔ اکرام کو ان کے اندازوں پر زبردست اعتماد تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ پریشان ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

انسپکٹر جمشید شیخ صاحب کے دفتر کی طرف جا رہے تھے کہ ان کے اسسٹنٹ سامنے سے آتے نظر آئے۔

''شیخ صاحب تو جیپ میں بیٹھ بھی چکے ہیں۔''

''اوہ، اچھا۔'' وہ جیپ کی طرف لپکے۔ شیخ صاحب انہی کی طرف دیکھ ہے تھے۔

''بہت دیر لگا دی جمشید۔'' ان کے ان الفاظ کے ساتھ ہی ڈرائیور نے پ سٹارٹ کر دی اور انسپکٹر جمشید اگلی سیٹ کی طرف بڑھے۔

''میرے ساتھ ہی آ جاؤ پچھلی سیٹ پر۔'' شیخ صاحب بولے۔

ان کے بیٹھتے ہی جیپ چل پڑی۔ انسپکٹر جمشید خاموش بیٹھے رہے۔ شیخ صاحب کے طرز عمل سے انہوں نے جان لیا تھا کہ وہ بہت پریشان ہیں۔ اور اگر کچھ بتانا پسند کریں گے تو خود ہی بتا دیں گے۔ ان کے اندازے کے مطابق آئی جی صاحب ہونٹ بھینچے بیٹھے رہے۔ یہاں تک کہ آدھ گھنٹے کے سفر کے بعد ان کی جیپ ایک عظیم الشان عمارت کے سامنے رکی۔ انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا، کیونکہ جیپ ایوان صدر کے سامنے رکی تھی۔

''ہاں جمشید، صدر صاحب نے تمہیں فوری طور پر بلایا ہے۔'' انہوں نے جیپ سے اترتے ہوئے دبی آواز میں کہا۔

''تو کیا......'' وہ کہتے کہتے رک گئے۔ آئی جی صاحب نے آنکھ کے اشارے سے انہیں خاموش ہی رہنے کا اشارا کیا تھا۔ ملٹری کے دو مسلح نوجوان ان کی جیپ کی طرف بڑھے۔ استقبالیہ انداز میں انہوں نے سلام کیا اور پھر انہیں ساتھ لے کر اندر کی طرف چلے۔ روش پر بچھے ہوئے قالین پر چلتے ہوئے وہ ایک کمرے تک لائے گئے۔ انہوں نے دیکھا، صدر مملکت ایک صوفے میں بیٹھے تھے۔ ان کے بالکل ساتھ ایک اور صاحب بیٹھے تھے۔ ان پر نظر پڑتے ہی انسپکٹر جمشید جان گئے کہ معاملہ کیا ہو سکتا ہے۔

''السلام علیکم سر۔'' وہ اور آئی جی ایک ساتھ بولے۔

''آیئے شیخ صاحب اور جمشید تم بھی۔'' صدر صاحب دھیمی مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے بولے: ''ان سے ملیے، ہمارے دوست ملک سیرات کے صدر جوناف۔''

''خدانخواستہ، دشمن ملک کی فوجوں کے سامنے آپ کی فوجوں نے ہتھیار تو

نہیں ڈال لیے۔ یا ایسی ہی کوئی صورت تو پیش آنے والی نہیں۔" انسپکٹر جمشید اپنی پریشانی پر قابو نہ رکھ سکے اور کہہ ہی اُٹھے۔

"واہ، جیسا ان کے بارے میں سنا تھا، یہ شاید اس سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔" صدر جوناف نے تعریف کی۔

"نہیں جمشید، ایسی کوئی بات نہیں، لیکن ایسا وقت آتا نظر ضرور آرہا ہے۔" صدر مملکت بولے۔

"اوہ۔" ان کے اور آئی جی صاحب کے منہ سے نکلا، پھر وہ سامنے والے صوفے میں بیٹھ گئے۔

"جمشید، تمہیں محمود، فاروق اور فرزانہ کو ساتھ لے کر اسی وقت سیرات کے لیے روانہ ہونا ہے۔ صدر صاحب بھی تمہارے ساتھ ہی جائیں گے۔ حالات یہ راستے میں بتا دیں گے۔"

"کیا آپ اشارۃً بھی حالات بتانا پسند نہیں کریں گے۔"

"صرف اتنا سن لو کہ سیرات کی فوجیں دشمن کے مقابلے میں بدستور ڈٹی ہوئی ہیں، لیکن دشمن بھی ان کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کی تیاری کر چکا ہے۔ اس نے ملک کے اندر افراتفری پھیلا دی ہے۔ ہر طرف بموں کے دھماکے ہو رہے ہیں۔ لوگوں کی جانیں اور مال محفوظ نہیں رہے، لوگ اِدھر اُدھر بھاگ رہے ہیں، لیکن کہیں بھی ان کے لیے کوئی محفوظ مقام نہیں رہا۔ ان حالات میں وہ اپنے فوجیوں کے حوصلے کیسے بلند رکھ سکتے ہیں۔ کیسے ان کی ہر ممکن مدد کر سکتے ہیں۔ فوج بھی اندرونی حالات سے بے خبر نہیں رہی، لہٰذا وہ بھی بددل ہوتی جا رہی ہے۔ اگر ملک کے اندرونی حالات سدھر جائیں۔ دھماکوں کا سلسلہ بند ہو جائے تو پورے ملک کو بچایا جا سکتا ہے، پھر ایک کامیاب جنگ لڑی جا سکتی ہے۔"

"لیکن سر، ان حالات میں بھلا میں کیا کر سکتا ہوں۔" انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر کہا۔

"میں نہیں جانتا، تم کیا کر سکتے ہو اور کیا نہیں۔ میرا حکم تو یہ ہے کہ تم صدر صاحب کے ساتھ ان کے ملک جاؤ گے اور اسے ہر قیمت پر بچاؤ گے۔ دشمن طاقتیں اگر اپنے صرف ایک آدمی کو بھیج کر حکومتوں کے تختے الٹ دیتی ہیں تو کیا ہم ایک آدمی کو بھیج کر تختہ الٹنے سے بچانے کی امید نہیں کر سکتے۔" صدر مملکت کی آواز جذباتی ہو گئی۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں سر، میں ضرور جاؤں گا اور اپنی پوری کوشش کروں گا۔ گر کچھ نہ بن سکا تو اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دوں گا، لیکن میری ایک درخواست ہے۔"

"جلدی بتاؤ۔"

"میں اپنے دوستوں کو بھی ساتھ لے جانا پسند کروں گا۔ میرا مطلب پروفیسر داؤد اور خان رحمان وغیرہ سے ہے۔"

ان کی اس بات کے جواب میں صدر مملکت پراسرار انداز میں مسکرائے۔

اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور ان کی نظریں دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔

☆☆

"یار، یہ لوگ بھی عجیب بے مروت لوگ ہیں۔" فاروق نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کون لوگ بھئی؟" محمود چونکا۔

انسپکٹر جمشید کے دفتر جانے کے بعد ابھی تک ناشتے کی میز پر ہی موجود تھے۔ ان دنوں وہ موسم بہار کی چھٹیاں منا رہے تھے۔ یہ جملہ فاروق نے اچانک ہی کہا

تھا۔ فرزانہ بھی اسے گھورنے لگی۔

''بھئی، وہی آفتاب، آصف اور فرحت۔ اور کون؟'' فاروق نے بُرا سا منہ بنایا۔

''وہ عجیب بے مروت کس طرح ہو گئے بھلا؟''

''بھئی دیکھو نا، کئی روز پہلے ہم انہیں کھلونا ہتھیاروں کا ایک پارسل بنا کر بھیج چکے ہیں، لیکن وہ ہیں کہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ ان میں سے کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ اتنا نہیں ہو سکا کہ ایک خط لکھ کر یہ اطلاع ہی دے دیں کہ کھلونے مل گئے ہیں۔''

''بات تو فاروق کی بالکل بجا ہے، کیوں فرزانہ؟''

''ہاں، میرا ابھی بھی خیال ہے۔'' فرزانہ بولی۔

''تو پھر کیوں نہ انہیں فون کریں۔ انہیں بھی موسم بہار کی چھٹیاں ہوں گی اور اس وقت وہ گھر میں ہی ہوں گے۔'' فاروق نے مشورہ دیا۔

''تم ہی کرو فون، مجھے تو اس کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی ہے۔'' فرزانہ نے منہ بنایا۔

''اور تم کیا کہتے ہو محمود؟''

''ٹھیک ہے، فون تم ہی کرو۔ ضرورت پڑی تو ایک آدھ بات میں بھی کر لوں گا۔'' محمود نے گویا فیصلہ دیا۔

''اچھی بات ہے، تو میں فون کرتا ہوں۔'' اس نے کہا اور فون پر جٹ گیا۔ انسپکٹر کامران مرزا کے گھر کا فون نمبر انہیں یاد تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد کہیں جا کر سلسلہ ملا اور دوسری طرف سے آفتاب کی آواز سنائی دی۔

''ہیلو، آفتاب بول رہا ہوں۔ آپ کون ہیں؟''

''یار تم لوگ عجیب احمق ہو۔'' فاروق نے جھلاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہائیں، یہ کون صاحب ہیں جو ہمیں عجیب احمق بتا رہے ہیں۔ سنو بھائی، ہم غریب احمق تو ہو سکتے ہیں، عجیب احمق ہرگز نہیں ہو سکتے، کیونکہ احمق عجیب ہو ہی نہیں سکتے، ہاں غریب ضرور ہو سکتے ہیں، بلکہ پوری فراخدلی کے ساتھ غریب ہو سکتے ہیں۔''

''ہائیں ہائیں، آفتاب یہ تم بول رہے ہو۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری صحبت کا اثر تم اس حد تک لے سکتے ہو۔''

''کیا مطلب؟'' ''ارے مگر، آپ ہیں کون؟''

''بھئی کانوں میں کچھ تیل ویل ڈلوایا کرو۔ زنگ لگ گیا ہے، شاید انہیں۔'' فاروق نے منہ بنایا۔

''ارے، ہیں، یہ آواز تو بھائی فاروق کی محسوس ہوتی ہے۔ ٹھہرو یار میں ذرا آصف اور فرحت کو آواز دے لوں۔''

''ارے ارے، اس میں اس قدر گھبرانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں فون پر تمہیں مار تو نہیں بیٹھوں گا۔''

''مار تو خیر تم میرے سامنے بھی نہیں سکتے۔ ان دنوں میں زبردست تیاریوں میں ہوں۔ جوڈو کراٹے کے وہ وہ داؤ سیکھ لیے ہیں میں نے کہ چھٹی کا دودھ یاد دلا دوں گا۔ اور ہاں، تم نے کیا کہا، کانوں میں تیل ڈلوایا کروں، لیکن کون سا تیل، یہ بھی تو بتاؤ۔ کیونکہ میں واقعی تقریباً ایک فیصد اونچا سننے لگا ہوں۔''

''ایک فیصد اونچا، کمال ہے، لیکن نہیں، ہم بہت دور نکل جائیں گے۔ دوسرے لفظوں میں بات دور نکل جائے گی۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ تم لوگ عجیب احمق ہو۔''

"اور تم نے بھی میرا جواب سن ہی لیا ہے، اب یہ کہو......"

"کون ہے فون پر آفتاب۔" فاروق نے آصف کی آواز سنی۔

"فاروق۔" آفتاب کی آواز سنائی دی۔ اس نے محسوس کیا، فاروق کہتے وقت اس نے منہ بنایا تھا۔

"فاروق، ارے۔" فرحت کی چہکتی آواز فون میں گھس آئی۔

"کیا کہہ رہا ہے؟" آصف نے پُر اشتیاق لہجے میں پوچھا۔

"کہہ رہا ہے، تم لوگ عجیب احمق ہو۔"

"یعنی کہ ہم۔ اچھا، ذرا فون مجھے دینا۔ میں بتاتا ہوں اسے۔" آصف کی آواز سنائی دی اور فاروق نے فوراً محمود سے کہا:

"ادھر فون آصف نے لے لیا ہے۔ کیا خیال ہے، اب تم فون سننا پسند کرو گے۔"

"لاؤ، اس میں کیا حرج ہے۔" اس نے لاپروائی سے کہا اور ریسیور لے لیا۔

"ہیلو فاروق، یہ میں ہوں آصف، تم نے ہمیں عجیب احمق کس سلسلے میں کہا۔ لیکن نہیں ٹھہرو، یہ سلسلہ جاننے سے پہلے میں بھی تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ تم انتہائی وعدہ خلاف لوگ ہو۔"

"ہیلو آصف، اس وقت ریسیور میرے ہاتھ میں ہے، لہٰذا ذرا سنجیدگی سے گفتگو کرو، ہمیں وعدہ خلاف کہہ کر تم سستے نہیں چھوٹ جاؤ گے، بلکہ یہ بات تمہیں بہت مہنگی بھی پڑ سکتی ہے اور تم جانتے ہی ہو، آج کل مہنگائی کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے، لہٰذا تم اسے خرید نہیں سکو گے۔ ہمیں وعدہ خلاف کہنے سے پہلے تم ہماری بات کا جواب دو، جس کی بنا پر فاروق نے تمہیں عجیب احمق کے نام سے نوازا ہے اور میرے

خیال میں اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی کو بالکل درست خطاب دیا ہے۔"

"اوہو اچھا۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"خاموش رہو۔ میں فون پر بات کر رہا ہوں۔" محمود نے فاروق کو ڈانٹا۔

"خاموش ہی تو ہوں۔ بول تو تم خود ہی رہے ہو۔" دوسری طرف سے آصف نے جھنجھلا کر کہا۔

"اوہو، میں تم سے نہیں، فاروق سے مخاطب ہو گیا تھا اور بھول میں ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھنا بھول گیا۔"

"چلو خیر، کوئی بات نہیں۔ ہاں تو سنو تم لوگ وعدہ خلاف کس طرح ہو۔" آصف نے رکے بغیر کہنا چاہا، لیکن محمود نے اس کی بات اچک لی۔

"پہلے یہ سن لو کہ تم لوگ عجیب احمق کس طرح ہو۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔"

"تو پھر یہ بھی نہیں ہو سکتا۔"

"یہ کیا شروع کر دیا تم نے۔" فرزانہ نے جلا کر کہا اور ریسیور اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔

"ابھی تو کہہ رہی تھیں کہ مجھے فون کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"ارے محمود، تمہاری آواز زنانہ آواز سے کیسے بدل گئی بھئی حیرت ہے۔" آصف نے حیران ہو کر کہا۔

"لاحول ولاقوۃ، ادھر فون شاید فرزانہ نے پکڑ لیا ہے۔ لاؤ ریسیور مجھے دو۔"

یہ کہہ کر فرحت نے ریسیور جھپٹ لیا اور کان سے لگاتے ہوئے بولی:

"ہیلو فرزانہ، یہ لوگ تو یوں ہی لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں، بات صرف اتنی ہے کہ تم نے اب تک اپنا وعدہ پورا نہیں کیا، یعنی کھلونے ہتھیار ارسال نہیں کیے۔"

''دھت تیرے کی۔'' فرزانہ کے منہ سے محمود کا تکیہ کلام نکلا۔

''ہم نے بھی انہی کھلونوں کی وجہ سے فون کیا ہے۔ اطلاعاً عرض ہے کہ آج سے کچھ دن پہلے ہم تین کھلونے پروفیسر انکل سے ہوا کر پارسل کی صورت میں روانہ کر چکے ہیں۔''

''ہائیں، یہ تم کیا کہہ رہی ہو، ہمیں تو ایسا کوئی پارسل نہیں ملا۔'' فرحت نے چونک کر کہا۔

''کیا، نہیں ملا۔ تب پھر پارسل کہاں گیا؟'' فرزانہ کے منہ سے حیرت بھرے انداز میں نکلا۔

''میں کیا کہہ سکتی ہوں کہ پارسل کہاں گیا۔ ٹھہرو، میں ان دونوں سے مشورہ کرتی ہوں۔''

اس کے ساتھ ہی فرحت کی آواز آنا بند ہو گئی۔ کوئی اور آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ فرحت نے ریسیور پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ یہ محسوس کرتے ہوئے اس نے ان سے کہا:

''لو بھئی، وہ پیکٹ تو ان تک نہیں پہنچا۔''

''حیرت ہے، اس پر تو ہم نے اپنا پتا بھی لکھا تھا، اگر وہ کسی وجہ سے ان تک نہیں پہنچا تھا، تو واپس ہمارے پاس تو پہنچنا چاہیے تھا۔'' محمود بولا۔

''فاروق، ذرا اس پارسل کی رسید تو نکال لانا، شاید رسید نمبر انہیں بتانا پڑے گا۔''

''اچھا۔''

فاروق نے کہا اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ اسی وقت فرحت کی آواز سنائی دی:

''ہیلو فرزانہ، کیا تم اس طرف موجود ہو۔''

''ہاں، کیا بات ہوئی۔''

''تمہارا ارسال کردہ پیکٹ ہمیں واقعی نہیں ملا۔ آفتاب اور آصف کا خیال ہے کہ چونکہ ہم جاسوس ہیں، لہٰذا اس پارسل کا سراغ لگائے بغیر چین سے نہیں بیٹھیں گے، لہٰذا مہربانی فرما کر اس ڈاکخانے کی رسید کا نمبر اور تاریخ وغیرہ لکھوا دو۔''

''اچھی بات ہے، فاروق رسید نکالنے گیا ہے۔ ٹھہرو، وہ آ گیا ہے۔ لو نمبر نوٹ کرو۔'' یہ کہہ کر فرزانہ نے نمبر نوٹ کرا دیے۔ اس کا نمبر ۱۳۹ تھا اور وہ اس ماہ کی سات تاریخ کو کاٹی گئی تھی۔

''ہم ابھی اور اسی وقت پارسل کے سراغ کی مہم شروع کرتے ہیں۔''

''جوں ہی پارسل ملے، ہمیں اطلاع دینا۔''

''فکر نہ کرو، نہ ملنے کی صورت میں بھی ہم شام کو فون ضرور کریں گے۔'' فرحت نے کہا۔

ٹھیک اسی وقت ان کے دروازے کی گھنٹی بجی۔

☆☆☆

کھلونوں کی بے چینی

فرحت نے ریسیور رکھ کر ان کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن کے آثار تھے۔

"آخر وہ پارسل کہاں گیا؟"

"یہ معلوم کرنا پڑے گا۔ محمود، فاروق اور فرزانہ جھوٹے تو بالکل بھی نہیں ہیں۔" آصف نے کہا۔

"پارسل تو انہوں نے ضرور بھیجا ہے۔ پارسل چونکہ رجسٹرڈ ہوتا ہے، اس لیے پوسٹ مین کو پہنچا کر دستخط لینا پڑتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ پارسل کس نے وصول کیا ہے اور کیوں، اسے ہمارا پارسل وصول کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" فرحت کہتی چلی گئی۔

"بات عجیب ضرور ہے، لیکن اتنی بھی نہیں کہ ہم اس کے لیے دن کا چین اور رات کا آرام حرام کر دیں۔" آفتاب نے منہ بنایا۔

"تو کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں، حالانکہ ان دنوں ہم بالکل فارغ ہیں۔" فرحت نے جلا کر کہا۔

"اگر تم خود کو اتنا ہی فارغ خیال کرتی ہو تو ضرور خاک چھانو۔ مجھے تو جاسوسی ناول پڑھنا ہے اور یہ تو تم دونوں ہی جانتے ہو کہ جاسوسی ناول پڑھنا کتنا

ضروری کام ہے۔ لوگ اپنا اصل کام چھوڑ کر ناول میں ڈوب جاتے ہیں۔ بچے اسکول کا کام بھول کر ناول شروع کر دیتے ہیں، اگرچہ ناول نگار ان سے درخواست بھی کر چکا ہوتا ہے۔ کہ بھئی، پہلے کام پھر جاسوسی ناول۔" آفتاب نے شریر لہجے میں کہا۔

"پہلے کام، پھر کھیل تو ہم نے سُنا تھا۔ یہ پہلے کام، پھر جاسوسی ناول آج ہی سُنا ہے۔" آصف نے حیران ہو کر کہا۔

"سننے پر نہ جاؤ۔ اس دنیا میں انسان کو نہ جانے کیا کچھ سُننا پڑتا ہے۔" آفتاب نے سر کو جھٹکا دیا۔

"خیر، اگر تم اس سلسلے میں بھاگ دوڑ نہیں کرنا چاہتے تو نہ سہی، میں اور فرحت چلے جاتے ہیں۔ رسید نمبر تو ہمارے پاس ہے ہی۔ یہ بھی سُن لو، اگر ہم نے پارسل حاصل کر لیا تو تیسرا کھلونا تمہیں نہیں ملے گا۔"

"کیا کہا، مجھے نہیں ملے گا، تو کیا تم اسے آدھا آدھا تقسیم کر لو گے۔" آفتاب نے آنکھیں نکالیں۔

"نہیں، ہم اتنے بے وقوف نہیں ہیں۔ ہم اسے باری باری استعمال کریں گے۔" آصف مسکرایا۔

"اوہ، یہ تو بہت بُرا ہوگا۔ میں پروفیسر داؤد انکل کے کھلونے سے محروم ہونا کسی قیمت پر منظور نہیں کروں گا۔ ناول کا کیا ہے، وہ تو کسی وقت بھی پڑھا جا سکتا ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ، یار تم تو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہو۔" آصف نے اسے گھورا۔

"حالانکہ میں نے گرگٹ آج تک نہیں دیکھا۔" آفتاب مسکرایا۔

"توبہ ہے تم سے۔ اب چلنا ہے تو چلو۔ بے چینی سے میرا بُرا حال ہے۔"

فرحت نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''لیکن کس چیز کی بے چینی؟''

''کھلونوں کی بے چینی۔ کوئی شخص انہیں حاصل کر کے مزے اڑا رہا ہوگا اور ہم یہاں بیٹھے جھگڑ رہے ہیں۔ ہمیں تو اس کے خلاف ڈٹ جانا چاہیے، بلکہ سیسہ پلائی دیوار بن جانا چاہیے۔''

''تو بن جاؤ تم دیوار، میں تو انسان ہی رہنا پسند کرتا ہوں۔''

''چلو فرحت، یہ حضرت تو بس یوں ہی ادھر ادھر کی ہانکے چلے جاتے ہیں۔''

''ارے بابا، چل تو رہا ہوں۔''

وہ شہناز بیگم کے پاس آئے، آفتاب ان سے بولا:

''امی جان، ہم ذرا جنرل پوسٹ آفس جا رہے ہیں۔''

''کیوں، یہ بیٹھے بٹھائے وہاں جانے کی کیا ضرورت پڑ گئی، اور ہاں، یہ تم فون پر کس سے باتیں کر رہے تھے؟'' انہوں نے چونک کر کہا۔

''محمود، فاروق اور فرزانہ کا فون تھا۔ انہوں نے پروفیسر انکل سے ہمارے لیے تین کھلونے بنوا کر ان کا پارسل ہمیں بھیجا تھا، لیکن پارسل ہم تک پہنچا ہی نہیں۔ ہم اسی کے بارے میں پتا کرنے جا رہے ہیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے، جلدی لوٹنے کی کوشش کرنا۔''

''جی، آپ فکر نہ کریں، ہمیں تو ابھی اسکول کا کام بھی کرنا ہے۔'' آفتاب نے جلدی سے کہا۔

''اور آفتاب کو تو جاسوسی ناول بھی پڑھنا ہے۔'' فرحت نے لقمہ دیا۔

''ایک تو میں ان کے جاسوسی ناولوں سے تنگ آ گئی ہوں۔ جب دیکھو،

جاسوسی ناول تھامے بیٹھے ہیں۔ اچھا خیر، جاؤ۔''

وہ گھر سے نکل کر موٹر سائیکلوں پر بیٹھے اور جی پی او کی طرف روانہ ہو گئے، پھر پوچھتے پچھاتے متعلقہ کلرک تک پہنچے۔ اسے رسید نمبر بتایا گیا۔ کلرک چند رجسٹر الٹ پلٹ کرنے کے بعد ایک رجسٹر کے ورق الٹنے لگا۔ آخر ایک صفحے پر رکتے ہوئے بولا:

''جی ہاں، وہ رجسٹرڈ پارسل آفتاب احمد کے نام تھا۔ سات جون کو ارسال کیا گیا تھا۔ دوسرے دن یہاں پہنچا اور اسی دن وصول کر لیا گیا۔ کیا وہ آپ نے وصول نہیں کیا تھا؟''

''جی، اگر وصول کیا ہوتا تو ہمیں یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔'' آصف نے کہا۔

''تب پھر وہ کسی اور نے وصول کر لیا ہے۔ ٹھہریے، میں متعلقہ پوسٹ مین کو بلاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے گھنٹی بجائی۔ چپراسی آیا تو اس نے بولا:

''پوسٹ مین نمبر اکاسی کو بلاؤ۔''

''جی بہتر۔''

تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھا پوسٹ مین اندر داخل ہوا۔ اس نے کلرک کو سلام کرتے ہوئے کہا:

''کیا حکم ہے جناب؟''

''یہ پارسل غلط آدمی کو دے دیا گیا ہے۔ اصل مالک یہ بیٹھے ہیں۔''

اس نے رجسٹر میں دیکھا، پھر اپنے بیگ میں سے ایک کاپی نکالی۔ اسے کھول کر دیکھا۔ چند لمحے تک سوچ میں گم رہا اور پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا:

''نہیں سر، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں نے یہ پارسل اسی پتے پر پہنچایا

تھا۔"

"اور وصول کرنے والا گھر کے اندر سے نکلا تھا؟" آفتاب نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی، جی نہیں، دروازے پر ہی کھڑا تھا۔ میں گھنٹی بجانے لگا تو اس نے کہا، ہاں جناب کیا بات ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ آفتاب احمد کے نام کا پارسل ہے۔ اس پر اس نے کہا، میں ہی آفتاب احمد ہوں۔ اب چونکہ وہ پہلے سے گھر کے دروازے پر کھڑا تھا، اس لیے میں نے پارسل اسے دے دیا اور دستخط لے لیے۔" پوسٹ مین نے جلدی جلدی بتایا۔

"اس طرح تو کوئی بھی شخص آپ سے پیکٹ وصول کرسکتا ہے۔ کیا آپ لوگ تصدیق نہیں کراتے۔"

"گھر کے دروازے پر نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی، اس لیے میں نے ضرورت نہیں سمجھی۔" پوسٹ مین بولا۔

"نمبر اکاسی تم سے زبردست غلطی ہوئی۔ وہ پارسل دراصل ان کا تھا۔" کلرک نے اسے بتایا۔

"اوہ۔" اس کے منہ سے نکلا۔ آنکھوں میں خوف دوڑ گیا۔

"اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض کردیں کہ اس پارسل میں بہت ہی قیمتی چیزیں تھیں۔ میرا خیال ہے، ہمیں کیس کر دینا چاہیے۔" آصف نے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔

"ارے نہیں، ایسا ظلم بھی نہ کیجیے۔ یہ بے چارہ معطل کردیا جائے گا۔"

"لیکن جناب، ہم اپنے پارسل کو کیسے بھول جائیں۔" آصف نے تیز آواز میں کہا۔

"مجھ پر رحم کیجیے جناب۔" پوسٹ مین نے گھبرا کر کہا۔

"اچھا تو الگ چل کر ہماری ایک بات سُن لیجیے۔" آفتاب نے عجیب بات کہی۔

"کیا مطلب، تم اس سے علیحدگی میں کیا بات کرنا چاہتے ہو۔" آصف نے گھورا۔

"خاموش رہو، پارسل میرے نام تھا۔" آفتاب نے منہ بنایا۔

"آخر آپ اسے علیحدہ لے جا کر کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"ایک بہت ضروری بات۔ آپ فکر نہ کریں، اگر انہوں نے میرے سوال کا جواب دے دیا تو ہم ان کے خلاف کیس نہیں کریں گے۔"

"جاؤ نمبر اکاسی۔ ان کی بات سن لو۔" کلرک بولا۔

اور پوسٹ مین اٹھ کر ان کے ساتھ باہر نکل آیا۔ وہ اسے عمارت کے ایک کونے میں لے گئے:

"اب بتائیے، سچ بات کیا ہے؟" آفتاب بولا۔

"سچ بات، کیا مطلب؟"

"وہ پارسل آپ نے کسے دیا تھا؟"

"مم، میں بتا چکا ہوں۔" وہ ہکلایا۔

"لیکن آپ نے غلط بتایا ہے۔ اصل بات کچھ اور ہے۔" آفتاب نے اسے گھورا۔

"نہیں تو، اصل بات تو یہی ہے۔ جو میں نے بتائی ہے۔"

"تب پھر ہم کیس کریں گے۔ تمہاری بچت اسی میں ہے کہ اصل بات بتا دو، پھر ہم نہ تو کیس کریں گے اور نہ تم سے کچھ کہیں گے۔" آفتاب نے کہا۔

پوسٹ مین کے چہرے پر ہچکچاہٹ کے آثار نمودار ہوئے۔ یہ دیکھ کر آصف نے جلدی سے کہا۔

''ہاں، یہ ہمارا وعدہ ہے۔''

''اور ہم اپنے وعدے سے کبھی نہیں پھرتے۔'' فرحت نے بھی پر زور لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے، میں اصل بات ضرور بتاؤں گا۔ ایک شخص نے لالچ دے کر مجھ سے وہ پارسل حاصل کر لیا تھا۔''

''کیا مطلب؟ کیا لالچ دے کر؟''

''میرے گھر میں جوان بیٹی بیٹھی ہے۔ مجھے اس کی شادی کرنا ہے لڑکے والے جہیز مانگتے ہیں۔ جہیز جمع کرتے کرتے لڑکی کی عمر تیس سال کے لگ بھگ ہو چکی ہے، وہ بارات لے کر نہیں آتے، مجھے ان حالات میں روپوں کی سخت ضرورت ہے۔ اس شخص نے جب مجھے دو ہزار روپے کا لالچ دیا تو میں لالچ میں آ گیا اور دو ہزار روپے اس سے لے کر پارسل اس کے حوالے کر دیا۔ اس نے آفتاب کے نام کے دستخط کر دیے۔''

''وہ آدمی آپ کو کہاں ملا تھا؟'' آفتاب نے فکر مندانہ لہجے میں کہا۔

''شاید اس نے میرا بہت دور تک تعاقب کیا تھا، پھر سڑک کے کنارے مجھے روک کر بات کی تھی، لیکن میں سڑک پر اس سے رقم نہیں لے سکتا تھا، کیا خبر وہ محکمہ رشوت ستانی کا کوئی آدمی ہو اور مجھے پکڑوا دے۔'' یہ سوچ کر میں نے اس سے کہا:

''میں پارسل آپ کو دینے پر تیار ہوں، لیکن رقم مجھے آپ اپنے گھر چل کر دیں گے، پارسل بھی میں آپ کو وہیں دوں گا۔''

''ٹھیک ہے، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آؤ میرے ساتھ۔'' اس نے کہا اور

مجھے اپنے گھر لے گیا۔ راستے بھر میں ادھر ادھر دیکھتا رہا کہ محکمہ رشوت ستانی کا عملہ تو تعاقب میں نہیں ہے، لیکن کوئی نظر نہ آیا۔ گھر میں داخل ہوتے وقت بھی میں نے دور دور تک دیکھ لیا اور آخر مجھے اطمینان ہو گیا کہ اس شخص کا ارادہ مجھے پکڑوانے کا ہرگز نہیں۔ چنانچہ گھر کا دروازہ اندر سے بند کروانے کے بعد میں نے اس سے دو ہزار روپے لے کر پارسل اس کے حوالے کر دیا اور وہاں سے نکل آیا۔ تین چار روز میں گھبراہٹ میں مبتلا رہا، لیکن پھر میری گھبراہٹ اور پریشانی دور ہو گئی اور جب میں بالکل بے فکر ہو گیا تو آپ لوگ آ پہنچے۔''

''ہوں، تو یہ بات ہے۔ اب آپ ہمیں صرف وہ گھر دکھا دیں، اس شخص سے اپنا پارسل ہم خود ہی حاصل کر لیں گے۔''

''مل، لیکن میرا کیا بنے گا۔'' پوسٹ مین ہکلایا۔

''فکر کی کوئی بات نہیں۔ ہم ہر طرح آپ کی مدد کریں گے۔ اور ہاں بھئی آصف، فرحت، تمہاری جیبوں میں اس وقت کتنے کتنے پیسے ہیں؟'' یہ کہہ کر آفتاب نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ وہ اس کا مطلب سمجھ گئے اور تینوں نے اپنی اپنی جیب سے نوٹ نکال کر اس کے حوالے کر دیے۔

''یہ۔ یہ کیا؟'' پوسٹ مین ہکا بکا رہ گیا۔

''آپ کی بیٹی کے جہیز کے لیے ہماری طرف سے، اگر آپ اس پتے پر آئیں تو ہم اور بھی بہت کچھ کر سکیں گے۔ اتنا کچھ کہ آپ فوری طور پر اپنی بیٹی کو رخصت کر سکیں گے۔''

''خ، خدا آپ کا بھلا کرے۔'' پوسٹ مین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

پھر وہ آصف کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ گیا۔ آفتاب نے فرحت کو بٹھایا اور چل پڑے۔ پوسٹ مین انہیں راستہ بتاتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ ایک پرانے سے

مکان کے سامنے رُکے۔ بوڑھے نے انہیں رکنے کا اشارہ کیا تھا۔

"بس جناب، یہی وہ مکان ہے، جس کے اندر وہ شخص مجھے لے گیا تھا اور دو ہزار روپے دے کر پارسل مجھ سے لے لیا تھا۔ مہربانی فرما کر مجھے اسی جگہ سے اجازت دے دیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ مجھے آپ کے ساتھ دیکھ لے۔"

"ٹھیک ہے، آپ جائیں۔" آصف بولا۔

"ایک منٹ، اس آدمی کا حلیہ بتاتے جائیں۔"

"وہ ایک موٹا اور بھدا سا آدمی تھا۔ رنگ سیاہی مائل تھا۔ سفید کپڑے پہن رکھے تھے۔"

"اپنا نام تو نہیں بتایا تھا اس نے؟"

"جی نہیں۔"

"خیر، ہم اسے دیکھ لیں گے۔" آفتاب نے اسے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اور جب وہ کافی دور چلا گیا تو وہ اس گھر کے دروازے کی طرف بڑھے۔ اپنی موٹر سائیکلیں کھڑی کیں اور آصف نے دروازے پر دستک دی۔ تیسری دستک کے بعد کہیں جا کر دروازہ کھلا اور انہیں ایک موٹے اور بھدے سے جسم والے آدمی کا چہرہ نظر آیا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

"ہمیں آپ سے کچھ ضروری بات چیت کرنا ہے۔" آصف نے قدرے سہم کر کہا۔

"ضروری بات چیت۔ کیا مطلب؟" وہ جھنجلا اٹھا۔

"جی ضروری بات کا مطلب تو ضروری بات ہی ہوتا ہے۔" آفتاب نے

گھبرا کر کہا۔

"تو کرو نا، کیا بات کرنا چاہتے ہو۔"

"یہاں دروازے پر کھڑے ہو کر بات کرنا کچھ مناسب نہیں ہوگا۔ آپ ہمیں اندر لے چلیں اور کسی مناسب سی جگہ پر بٹھا کر بات چیت کریں۔" آفتاب نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا۔

"لفظ مناسب سے تمہاری کوئی خاص رشتے داری ہے کیا۔" اس نے آفتاب کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

"ہر لفظ سے ہی رشتے داری ہے۔ کیونکہ ہماری مادری زبان ہے۔" فرحت جھٹ سے بولی۔

"ہاں واقعی، بہت ہی معقول جواب ہے۔" آصف نے خوش ہو کر کہا۔

"تم لوگ تو دیوانے سے لگتے ہو، خیر آؤ، ذرا دیکھیں تو تم کیا بات چیت کرنا چاہتے ہو۔" اس نے تنگ آ کر کہا اور انہیں اندر داخل ہونے کے لیے راستہ دیا، پھر انہیں لے کر ایک کمرے میں داخل ہوا۔ کمرہ بہت بوسیدہ سا تھا۔ دیواروں کا پلستر جگہ جگہ سے جھڑ چکا تھا۔ کرسیاں ٹوٹی پھوٹی تھیں۔

"بیٹھو، اور اب بتاؤ کیا بات ہے۔" اس نے خود بھی بیٹھتے ہوئے کہا۔

آفتاب، آصف اور فرحت کو گھر میں مکمل سناٹا محسوس ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا، جیسے اس کے علاوہ گھر میں کوئی نہ ہو۔ آصف سے رہا نہ گیا۔ پوچھ ہی بیٹھا۔

"کیا آپ اکیلے رہتے ہیں؟"

"ہاں، میرا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ میں بالکل اکیلا ہوں۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اوہ، ہمیں افسوس ہے، ہاں تو ہم اس پارسل کے سلسلے میں آپ کے پاس

آئے ہیں۔'' آصف نے جلدی سے کہا۔

''پارسل کے سلسلے میں، لیکن کون سے پارسل کے سلسلے میں؟''

''وہی پارسل جو آپ نے بوڑھے پوسٹ مین سے دو ہزار روپے دے کر وصول کیا تھا۔'' آفتاب نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''کون سے بوڑھے پوسٹ مین سے؟'' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

''کونسا پارسل، کون سا پوسٹ مین۔ دیکھو میاں سیدھی طرح بتادو ورنہ جیل میں نظر آؤ گے۔'' آفتاب نے جلا کر کہا۔

''لیکن کیا بتادوں، کچھ پتا بھی تو چلے۔''

''چند روز پہلے تم نے ایک پوسٹ مین کو دو ہزار روپے کا لالچ دے کر ایک پارسل حاصل کیا تھا۔ اس کی رسید پر جعلی دستخط کیے تھے، وہ پارسل ہمارا تھا۔''

''ضرور تم لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے کسی پوسٹ مین سے کوئی پیکٹ وصول نہیں کیا۔'' اس نے بُرا سا منہ بنایا۔

''تب پھر ہمیں اس پوسٹ مین کو یہاں لانا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے، لے آؤ۔ جب میں نے ایسا کوئی کام کیا ہی نہیں تو مجھے کیا پروا۔'' اس نے کندھے اچکائے۔

''کیا یہ مکان تمہارا ہے۔'' فرحت نے کچھ سوچ کر کہا۔

''ہاں، میرا اپنا ہے، کرائے کا نہیں ہے''۔ اس نے کاٹ کھانے والے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے، شام کو ہم اس بوڑھے پوسٹ مین کو لے کر یہاں آئیں گے۔ ہمارے ساتھ پولیس بھی ہوگی۔'' آصف نے گویا دھمکی دی، پھر ان دونوں سے بولا۔

''آؤ بھی چلیں، یہاں سیدھی انگلیوں سے گھی نہیں نکلے گا۔''

''تو الٹی انگلیوں سے نکال لو نا یار۔'' آفتاب نے منہ بنایا۔ تینوں کمرے کے دروازے تک پہنچے تھے کہ موٹے نے کہا۔

''ٹھہرو، پولیس کو ساتھ لانے کی ضرورت نہیں، جو بات ہے وہ میں تمہیں بتائے دیتا ہوں۔''

تینوں مڑے اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ موٹے کے چہرے پر رو دینے کے آثار تھے، پھر اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک اٹھے۔

''ہائیں، تم تو رونے لگے۔''

''میں ایک معمولی سا جیب کترا ہوں۔ ایک شخص کی جیب میں پھولا ہوا بٹوہ دیکھ کر للچا گیا۔ اس وقت وہ جی پی او کے صدر دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ میں نے پوری صفائی سے بٹوہ نکالنے کی کوشش کی، لیکن اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور سرگوشی میں بولا:

''میں سامنے کھڑے پولیس مین کو آواز دے کر ابھی تمہیں گرفتار کرا سکتا ہوں، تمہاری چٹکی میں بلیڈ بھی موجود ہے، لہٰذا تم رنگے ہاتھوں پکڑے جاؤ گے اور دو چار سال کے لیے اندر ہو جاؤ گے، لیکن اگر تم میرا ایک کام کردو تو میں تمہیں گرفتار نہیں کراؤں گا۔''

''کیسا کام؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ابھی ایک پوسٹ مین یہاں سے نکلے گا، اس کے پاس ایک پارسل ہوگا، تمہیں اس سے وہ پارسل حاصل کرنا ہے، چاہے جیسے بھی حاصل کرو، لیکن یہ جان لو کہ وہ پارسل دوسرے پارسلوں کے ساتھ ایک بڑے سے تھیلے میں ہوگا اور تم اتنا بڑا تھیلا چھین کر بھاگنے میں کامیاب نہیں ہو سکو گے، لہٰذا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تم اسے

کچھ لالچ دے کر پارسل حاصل کر لو۔ میں تمہیں نہ صرف یہ کہ گرفتار ہونے سے بچا سکوں گا، بلکہ اس کام کے لیے تمہیں چار ہزار روپے بھی دوں گا۔ تم ان چار ہزار میں سے کچھ پوسٹ مین کو دے سکتے ہو۔" یہاں تک کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

"ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔ میں نے جلدی سے کہا اور اس نے جیب سے چار ہزار روپے کے سو سو والے نوٹ نکال کر میری طرف بڑھا دیے۔ ساتھ ہی ایک کارڈ بھی دیا کہ پارسل اسی پتے پر پہنچا دوں۔ اس نے دھمکی بھی دی کہ اگر پارسل نہ پہنچا تو میں پولیس میں رپورٹ ضرور درج کراؤں گا اور یہ کہ وہ میرا نام بھی جانتا ہے۔ پھر اس نے میرا نام بھی بتایا۔ مجھے اس کے منہ سے اپنا نام سن کر اور بھی حیرت ہوئی۔ ساتھ ہی مجھے خوف بھی محسوس ہوا۔ میرے دل نے مجھ سے کہا کہ یہ تو کوئی بہت ہی خطرناک آدمی ہے۔ آخر یہ میرے بارے میں کس طرح جانتا ہے۔ اسی وقت بوڑھا پوسٹ مین باہر نکلتا نظر آیا۔ اس کے اشارا کرنے پر میں بوڑھے کا تعاقب کرنے لگا، پھر اسے یہاں لے آیا۔ دو ہزار میں سودا طے ہوا اور میں نے اس سے پارسل لے کر دو ہزار روپے اسے دے دیے۔ پھر میں نے پارسل کارڈ پر لکھے پتے پر پہنچا دیا۔" یہاں تک کہہ کر موٹا آدمی خاموش ہو گیا۔

"اس کارڈ پر کیا نام پتا لکھا تھا؟" آفتاب نے حیران ہو کر کہا۔

"مجھے یاد نہیں، وہ کیا نام اور نمبر تھا۔ سڑک کا نام ضرور یاد ہے۔ ہمالیہ روڈ تھی۔ میں آپ کو وہ کوٹھی دکھا سکتا ہوں۔ اس کے دروازے پر نیم پلیٹ بھی لگی ہے۔ نیم پلیٹ پڑھ کر مجھے نام فوراً یاد آ جائے گا۔"

"ٹھیک ہے، تو پھر چلو، کیونکہ اس شخص کے ہاتھوں تو تم گرفتار ہونے سے بچ بھی گئے تھے، ہمارے ہاتھوں نہیں بچ سکو گے۔ یہ صرف اسی وقت ممکن ہو گا، جب ہمارا پارسل ہمیں واپس مل جائے گا۔"

"میں تمہارے ساتھ چلنے کے لیے ہوں۔" اس نے کہا۔

"کیا پارسل اس آدمی نے وصول کیا تھا، جو تمہیں جی پی او کے صدر دروازے پر ملا تھا؟"

"نہیں، وہاں ایک اور آدمی ملا تھا۔" اس نے بتایا۔

"تو پھر چلو۔"

وہ گھر سے باہر نکلے۔ موٹے نے گھر کے دروازے پر تالا لگایا اور ان کے ساتھ روانہ ہوا۔ تقریباً آدھ گھنٹے تک وہ اس کے اشاروں پر چلتے رہے۔ ان کی حیرت ہر لمحے بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر ان کے پارسل کو حاصل کرنے کے لیے اتنے پاپڑ کیوں بیلے گئے ہیں۔ کسی کو یہ کس طرح معلوم ہو گیا تھا کہ ان کے نام ایک پارسل بھیجا گیا ہے۔ کہیں یہ کوئی سمگلنگ کا چکر تو نہیں اور کسی دوسرے پیکٹ کے چکر میں ان کا پیکٹ ادھر سے ادھر ہو گیا ہو، لیکن یہ کیسے ممکن تھا، سمگلنگ کرنے والے ہر پیکٹ پر لوگوں کو چار چار ہزار روپے تو تقسیم نہیں کرتے پھرتے، نہ ہی ان کے پیکٹ بذریعہ ڈاک آتے ہیں، پھر یہ ضرور کوئی اور چکر ہے۔ یہی سوچتے ہوئے آخر وہ موٹے کے کہنے پر ایک سڑک پر مڑ گئے۔ انہوں نے دیکھا، اب وہ شہر سے باہر جانے والی سڑک پر تھے۔

"کیا وہ کوٹھی شہر سے باہر ہے؟" آصف نے پریشان ہو کر کہا۔

"نہیں ہے تو شہری حدود میں ہی، لیکن اس جگہ آبادی بہت کم ہے۔ کوٹھیاں بہت دور دور ہیں۔"

"ہوں، کہیں تم ہمارے ساتھ کوئی چکر تو نہیں چلا رہے۔" فرحت نے سرد آواز میں کہا۔

"چکر۔ بھلا میں کیا چکر چلاؤں گا، میری طرف سے تو تم یہیں سے لوٹ

چلو۔ میں تو خود اس کوٹھی تک جاتے ہوئے گھبرا رہا ہوں، کہیں اس آدمی سے ملاقات نہ ہو جائے جو سی پی او کے سامنے ملا تھا۔" اس نے ڈری ڈری آواز میں کہا۔

"گھبراؤ نہیں، تم تو بس ہمیں وہ کوٹھی دکھا دو۔ اس کے بعد ہم تمہیں ساتھ لے کر اندر نہیں جائیں گے۔ پوسٹ مین کو بھی ہم تمہارے سامنے نہیں لائے تھے۔"

آفتاب نے اسے دلاسا دیا۔

"شکریہ۔" اس کے منہ سے نکلا، ساتھ ہی اس نے کہا: "ارے ارے، ہم آگے نکل گئے، وہ کوٹھی پیچھے رہ گئی۔"

انہوں نے بریک لگائے موٹر سائیکلیں موڑیں اور واپس پلٹے، پھر جس کوٹھی کی طرف موٹے نے اشارا کیا، اس سے کچھ فاصلے پر ہی رک گئے۔

"تم یہاں سے واپس کس طرح جاؤ گے۔ بہتر یہی ہوگا کہ یہیں کہیں چھپ جاؤ۔ ہم جب یہاں سے واپس چلیں گے، تمہیں بھی ساتھ لے لیں گے۔"

"ٹھیک ہے، میں ایسا ہی کروں گا۔" اس نے فکرمندانہ انداز میں کہا۔

"بھئی تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" آصف نے اس کے کندھے پر تھپکی دی اور دونوں کو ساتھ لے کر کوٹھی کی طرف بڑھا۔ دروازے پر انوار شام کی پلیٹ لگی تھی۔

☆☆

انسپکٹر کامران مرزا کا چپراسی ان کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا:

"سر، ایک صاحب فوری طور پر آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ بہت گھبرائے ہوئے سے لگتے ہیں۔ ان کے پاس کارڈ بھی نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے، اندر بھیج دو۔" انہوں نے کہا۔

چپراسی کے نکلتے ہی ایک بدحواس سا آدمی اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے

پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی کہا:

"جہاں تک میرا خیال ہے، آفتاب، آصف اور فرحت کسی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔"

"جی کیا مطلب؟" انسپکٹر کامران مرزا چونکے۔

"میں شہر کی شمالی کنارے کی طرف رہتا ہوں، وہاں میری کوٹھی ہے۔ میں کوٹھی کے لان میں ٹہل رہا تھا کہ میں نے دو موٹر سائیکلوں سے آفتاب، آصف اور فرحت اور ایک اور موٹے آدمی کو اترتے دیکھا۔ موٹا آدمی تو درختوں کے جھنڈ کی طرف چلا گیا۔ اور آپ کے تینوں بچے اس کوٹھی کے دروازے پر پہنچے۔ انہوں نے دستک دی۔ دستک کے جواب میں دروازہ کھولا گیا اور میں نے انہیں اندر داخل ہوتے دیکھا، جوں ہی وہ اندر داخل ہوئے، میں اپنی کار میں بیٹھا اور آپ کی طرف دوڑ پڑا۔" یہاں تک کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

"بات کچھ پلے نہیں پڑی۔ آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ انہیں کس طرح جانتے ہیں اور یہ کہ اگر وہ کسی کوٹھی میں داخل ہوتے نظر آئے ہیں تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔"

"ہم۔ میں بتاتا ہوں۔ میرے بچے آپ کے بچوں کے کارنامے بہت ذوق اور شوق سے پڑھتے ہیں۔ مجھے اور اپنی امی کو بھی پڑھنے پر مجبور کرتے ہیں، لہٰذا ہم ان تینوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ان کی تصویریں اتنی بار دیکھی ہیں کہ میں انہیں دیکھتے ہی پہچان گیا۔ اب رہی ان کے اس کوٹھی میں داخل ہونے کی بات، تو اس کوٹھی میں کچھ عرصے سے میں غیر شریف لوگوں کی آمدورفت دیکھ رہا ہوں۔ کچھ عرصہ پہلے ایسا نہیں تھا۔ میں نے کوٹھی کے مالک سے بھی اس بات کا ذکر کیا تھا۔ اس نے بتایا کہ پہلا کرائے دار کسی اور کرائے دار سے کئی ہزار روپے لے کر کوٹھی اس کے حوالے

کر کے چلتا بنا۔ لہٰذا وہ نہیں جانتا کہ کوٹھی پر کون لوگ قابض ہیں، البتہ اس نے عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا ہے اور قانون کے ذریعے ہی کوٹھی کو خالی کرائے گا۔ اس کے اس جواب سے میں مایوس ہو گیا، تاہم میں ان لوگوں کی حرکات اور سکنات کا بغور جائزہ لیتا رہتا ہوں۔ یہ لوگ مجھے قطعاً پسند نہیں آئے۔ میں نہیں جانتا، آفتاب، آصف اور فرحت وہاں کس غرض کے لیے داخل ہوئے ہیں۔ میں نے تو اپنا فرض جانا کہ آپ کو اطلاع دے دوں۔"

"شکریہ، آپ نے اچھا کیا، میں ابھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ شاید وہ کسی چکر میں پھنس گئے ہیں۔" یہ کہہ کر انہوں نے گھر کے نمبر ڈائل کیے۔ فوراً شہناز بیگم کی آواز سنائی دی:

"ہیلو بیگم، تینوں کچھ بتا کر گئے ہیں۔"

"جی ہاں، آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

"پہلے میری بات کا جواب دو۔"

"وہ پارسل کی تلاش میں نکلے ہیں۔" انہوں نے کہا۔

"پارسل؟"

"ہاں، تھوڑی دیر پہلے محمود، فاروق اور فرزانہ کا فون آیا تھا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ کچھ دن پہلے وہ کھلونوں کا پارسل بھیج چکے ہیں، انہوں نے اس کی وصولی کی اطلاع کیوں نہیں دی۔ انہوں نے بتایا کہ انہیں تو پارسل ملا ہی نہیں۔ اس پر انہوں نے پارسل کا نمبر وغیرہ لکھوا دیا اور وہ اسی وقت پارسل کی تلاش میں چلے گئے۔"

"ہوں، وہ شاید کسی الجھن میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ میں ان کے پیچھے روانہ ہو رہا ہوں۔ ہم جلد ہی لوٹ آئیں گے۔ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"اچھی بات ہے۔" انہوں نے فکرمندانہ انداز میں کہا۔

"یہ کیا، میں نے تو یہ کہا ہے کہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔" انسپکٹر کامران مرزا نے آواز میں ہنسی شامل کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں تو میں کب پریشان ہوں۔ آپ بھی کوئی فکر نہ کریں۔" ادھر سے شہناز بیگم نے بھی ہنس کر کہا، لیکن حقیقت یہ تھی کہ دونوں ہی حد درجے فکرمند ہو گئے تھے۔ آخر انسپکٹر کامران مرزا ملاقاتی کے ساتھ باہر نکلے۔

"آپ نے اپنا نام نہیں بتایا۔"

"کاملین خان انجم۔" اس نے کہا۔

"کیا خیال ہے، آپ میری جیپ میں چلیں گے یا اپنی کار میں؟"

"میں اپنی کار میں چلتا ہوں، آپ جیپ پر چلیں، کیونکہ واپسی پر بھی تو آپ کو جیپ کی ضرورت پڑے گی، یا پھر میرے ساتھ کار میں تشریف رکھیے۔ میں ہی آپ کو واپس پہنچا دوں گا۔"

انسپکٹر کامران مرزا نے چند سیکنڈ کے لیے سوچا، پھر بولے:

"نہیں جناب، میں اپنی جیپ، میں ہی جانا پسند کرتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، آیئے میرے پیچھے۔"

کاملین خان انجم کار میں بیٹھ کر روانہ ہوا، انسپکٹر کامران مرزا اس کے پیچھے چلے۔ ان کا سفر تقریباً بیس منٹ میں ختم ہوا اور پھر کاملین خان انجم نے ایک جگہ کار روکتے ہوئے بتایا:

"وہ کوٹھی ہے جناب۔"

"ٹھیک ہے، آپ یہیں سے اپنی کوٹھی کی طرف چلے جایئے، تاکہ آپ کو شک کی نظروں سے نہ دیکھا جائے۔ معلوم یہی ہو کہ آپ شہر سے شاپنگ کر کے لوٹے ہیں۔ کار میں اگر کوئی پیکٹ وغیرہ ہے تو اسے بھی دونوں ہاتھوں میں اٹھا لیجیے گا۔"

"اچھی بات ہے۔" کالیمن خان انجم نے کہا اور کار آگے بڑھا دی۔

انسپکٹر کامران مرزا جیپ سے اترے اور کوٹھی کے دروازے کی طرف قدم اٹھانے لگے۔ انہیں ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا، لیکن وہ اس احساس کو سمجھ نہیں پا رہے تھے۔

☆☆☆

مسکراہٹ گم ہوگئی

انسپکٹر جمشید نے دیکھا، دروازے میں محمود، فاروق، فرزانہ پروفیسر داؤد اور خان رحمان داخل ہو رہے تھے:

"اوہو، آپ نے تو پہلے ہی سب انتظام کر رکھا ہے۔" ان کے منہ سے نکلا۔

"مجھے پہلے ہی یقین تھا کہ تم اپنے دوستوں کے بغیر جانا پسند نہیں کرو گے۔ اب یہ مجھے معلوم نہیں کہ یہ لوگ تمہارے ساتھ جانا چاہیں گے یا نہیں۔ ان سے بات کرنا تمہارا کام ہے، کیونکہ یہ ایک ایسی مہم ہے، جس کے لیے کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں، تمہیں ضرور مجبور کیا گیا ہے۔ وہ بھی اس لیے کہ میں تم پر اپنا بہت حق سمجھتا ہوں۔"

"آپ مطمئن رہیں سر، جمشید اگر ہمیں اپنے ساتھ جہنم میں بھی لے جانا چاہے گا، تو ہم انکار نہیں کریں گے۔ ویسے تو ہمیں یہ بھی امید ہے کہ جمشید جہنم میں نہیں جائے گا۔" خان رحمان نے ہنس کر کہا، پھر پروفیسر داؤد کی طرف مڑ کر بولے:

"کیوں پروفیسر صاحب، میں نے ٹھیک کہا ہے نا؟"

"بالکل، بعض اوقات تو تم واقعی ٹھیک کہہ جاتے ہو۔" پروفیسر داؤد مسکرائے۔

"تو پھر بیٹھیے، آپ لوگوں کو کسی قسم کی تیاری کا موقع نہیں دیا جا سکتا۔ اب

آپ لوگ یہیں سے ائیر پورٹ کی طرف لے جائے جائیں گے، وہاں صدر صاحب کا خصوصی طیارہ تیار کھڑا ہوگا، آپ لوگ اس میں بیٹھ کر آزادانہ مفت میں سفر کر سکیں گے۔''

''ہمیں تیاری کی ایسی ضرورت بھی کیا ہے، لیکن.....'' انسپکٹر جمشید کہتے کہتے رک گئے۔ اسی وقت تین آدمی تین سوٹ کیس اٹھائے اندر داخل ہوئے تھے۔ انہوں نے دیکھا، ان میں سے ایک انسپکٹر جمشید کا، دوسرا خان رحمان کا اور تیسرا پروفیسر داؤد کا تھا۔

''لیجیے، آپ لوگوں کا سفر کا ضروری سامان بھی حاضر ہے۔'' صدر صاحب نے مسکرا کر کہا۔

''آپ نے تو اس قدر زبردست تیاری کر رکھی ہے کہ آدمی کو حیران ہوئے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''اور مزے کی بات یہ طیارہ پرواز کرنے کے لیے بالکل تیار کھڑا ہے۔ سامان کا ہی انتظار تھا۔ یہاں سے آپ سب لوگ ایک بالکل بند گاڑی میں جائیں گے۔ گاڑی بلٹ پروف بھی ہے۔ یہ یاد رہے کہ مہمان صدر بالکل خفیہ طور پر آئے ہیں، یعنی ان کے ملک میں سوائے ایک دو آدمیوں کے اور کسی کو بھی معلوم نہیں کہ یہ اس وقت اپنے ملک میں نہیں ہیں۔ جس طیارے سے یہ آئے ہیں۔ وہ ایک خفیہ جگہ سے اڑا تھا اور اسی جگہ آپ لوگوں کو لے جائے گا۔ طیارے کا عملہ ضرور اس راز سے واقف ہے۔ لیکن وہ صدر صاحب کا با اعتماد عملہ ہے اور اسے بہت ہی چھان بین کے بعد ملازم رکھا گیا ہے۔''

''بہت بہتر، ہم بھی تیار ہیں۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''میں چاہتا ہوں، تم اپنے دوستوں سے ایک بار پھر پوچھ لو۔'' صدر

صاحب بولے۔

''اوہ، جی ہاں۔ کیوں پروفیسر صاحب، آپ کو اس مہم پر جانے میں کوئی اعتراض تو نہیں۔ مہم کی تفصیل بعد میں بتاؤں گا۔''

''قطعاً نہیں۔'' پروفیسر فوراً بولے۔

''خان رحمان تم کیا کہتے ہو؟''

''بالکل وہی جو پروفیسر صاحب نے کہا ہے۔'' وہ بولے۔

''یہ بھی سن لیں کہ مہم سے لوٹ کر آنے کی ایک فیصد بھی امید نہیں، تاہم خدا کو منظور ہوا تو ہم کامیاب اور کامران بھی لوٹ سکتے ہیں۔''

''یہ کہہ کر ہماری دوستی کے وقار کو کم نہ کرو جمشید، ہم وہ دوست نہیں، جو صرف سکھ اور چین کے دنوں میں ہی دوست رہتے ہیں اور پھر دوست کو مصیبت میں چھوڑ کر الگ ہو جاتے ہیں، کیوں پروفیسر صاحب۔''

''بالکل ٹھیک، باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔'' پروفیسر داؤد بولے۔

''ٹھیک ہے، پھر میں آپ لوگوں کو الوداع کہتا ہوں۔'' صدر مملکت بولے اور وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ صدر صاحب نے نہایت گرمجوشی سے سب سے مصافحہ کیا۔ سب سے آخر میں محمود، فاروق اور فرزانہ کی باری آئی۔

''تم تینوں کو بھیجتے ہوئے میں کوئی خوشی محسوس نہیں کر رہا، لیکن جانتا ہوں، تم جمشید کے بغیر یہاں رہنا پسند نہیں کرو گے اور نہ یہ تمہیں یہاں چھوڑ کر جانا پسند کریں گے۔''

''آپ ہمارے بارے میں فکر مند نہ ہوں۔'' محمود مسکرایا۔

انہیں ایک خفیہ راستے سے نکال کر طیارے تک پہنچایا گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا

جہاز تھا۔اس میں صرف دس آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔اس کے علاوہ چار آدمیوں پر اس کا عملہ مشتمل تھا۔ایک پائلٹ،ایک اس کا نائب،دو آدمی مسافروں کی خدمت کے لیے۔جس وقت وہ جہاز میں داخل ہوئے۔ان چاروں نے دروازے کے دو طرف ہو کر ان کا استقبال کیا۔ان کے سیٹوں پر بیٹھنے کے بعد پائلٹ اور اس کا اسسٹنٹ تو انجن روم میں چلے گئے اور انہوں نے انجن روم کا دروازہ بند کر لیا۔باقی دونوں آدمی اس انداز سے کھڑے ہو گئے کہ جوں ہی ان میں سے کسی کو کسی چیز کی ضرورت پڑے،وہ فوراً حاضر کر دیں۔

''ابا جان،وہ پارسل ان لوگوں تک نہیں پہنچا۔'' محمود کو اچانک خیال آیا۔

''کون سا پارسل؟'' وہ چونکے۔

''وہی جو ہم نے آفتاب،آصف اور فرحت کے لیے بھیجا تھا۔''

''کیوں،وہ پہنچا کیوں نہیں؟یہ کیسے ہو سکتا ہے۔'' انہوں نے حیران ہو کر کہا۔

''ہم خود حیران ہیں۔ہم نے انہیں فون کیا تھا،ایسے یہ بات معلوم ہوئی۔ تینوں نے پارسل کا سراغ لگانے کا ارادہ کیا ہے۔''

''ہوں۔خیر کوئی بات نہیں،لیکن بھئی اگر پارسل کسی وجہ سے ان لوگوں تک نہیں پہنچ سکا تھا تو واپس تو آ جانا چاہیے تھا۔''

''یہی بات تو حیرت میں ڈال رہی ہے۔''

''خیر،اس معاملے میں حیران ہونے کی بجائے ہمیں موجودہ کیس پر غور کرنا چاہیے۔میں صاحب صدر سے درخواست کروں گا کہ اب وہ اپنے ملک کے حالات تفصیل سے سنائیں تاکہ میرے سب ساتھی حالات سے اچھی طرح باخبر ہو جائیں اور مجھے بھی باقی کی تفصیل معلوم ہو جائے۔''

''ٹھیک ہے،میں بیان کرتا ہوں۔میرے ملک کی سرحدوں پر اس وقت جنگ جاری ہے۔دشمن طاقت میں بہت بڑا ہے۔سامان جنگ اس کے پاس ہماری نسبت کئی گنا ہے،لیکن کہا جاتا ہے کہ جنگیں ہتھیاروں سے نہیں،جذبوں سے لڑی جاتی ہیں۔ہماری فوج میں جذبہ بہت ہے۔جب کہ دشمن کے پاس جذبے کی بہت کمی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہماری فوجیں تعداد میں کم ہوتے ہوئے بھی اور سامان کی کمی کا شکار ہوتے ہوئے بھی پوری طرح ڈٹی ہوئی ہیں اور دشمنوں کی ایک نہیں چلنے دے رہیں۔جب دشمن نے یہ دیکھا کہ اس طرح بھی ہمیں شکست دینا ان کے لیے مشکل ہو رہا ہے تو اس نے اپنے کچھ خاص آدمی ہمارے ملک کے اندر داخل کر دیے یا پہلے سے اندر موجود اپنے آدمیوں کو اشارہ کر دیا۔اب وہ لوگ خفیہ طور پر جگہ جگہ بموں کے دھماکے کر رہے ہیں۔انہوں نے ٹرینوں کی کئی پٹریاں اڑا دی ہیں۔کئی اڈے تباہ کر دیے ہیں اور دن بدن ان کی حرکات نے عوام کو بوکھلا دیا ہے۔پہلے وہ جس اطمینان اور سکون سے اپنے فوجیوں کا حوصلہ بڑھا رہے تھے،انہیں مدد پر مدد بھیج رہے تھے،اب وہ اطمینان اور سکون رخصت ہو چکا ہے۔ان کے اندر بے اطمینانی نے جگہ بنا لی ہے۔وہ گھبراہٹ کا شکار ہو گئے ہیں۔فوجوں کو بھی ملک کے اندرونی حالات کا علم ہو گیا ہے،لہٰذا ان کے قدم بھی اب پہلے کی مانند مجھے نظر نہیں آتے۔اگر یہ حالات پندرہ دن اور رہے تو ہم جنگ ہار جائیں گے۔ہمیں ہتھیار ڈالنا پڑیں گے اور ملک پر دشمنوں کا قبضہ ہو جائے گا۔میں ان حالات کی وجہ سے بہت پریشان ہو گیا تھا۔مجھے اپنی کامیابی کی ایک فیصد بھی امید نہیں رہی تھی۔ایسے میں مجھے تمہارا خیال آیا اور میں نے آپ لوگوں تک پہنچنے کا پروگرام بنا لیا۔ضرورت مند دیوانا ہوتا ہے،لہٰذا اس وقت میں بھی دیوانا ہی ہوں۔'' یہاں تک کہہ کر صدر جوناف خاموش ہو گئے۔

''ایک گلاس پانی لانا بھئی۔'' انسپکٹر جمشید نے عملے کے دونوں آدمیوں کی

طرف دیکھے بغیر کہا۔

"بہت بہتر جناب۔" انہوں نے ملازم کی آواز سنی۔ جلد ہی ایک گلاس ان کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ انہوں نے گلاس لیا اور پھر ہونٹوں سے لگانے ہی لگے تھے کہ گلاس ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گرا۔ جہاز کو ایک تیز جھٹکا لگا تھا۔ گلاس کا پانی نیچے بچھے ہوئے قالین میں جذب ہو گیا۔ گلاس ٹوٹ نہیں سکا تھا۔ خدمت گار نے فوراً گلاس اٹھا لیا:

"میں دوسرا لے آتا ہوں سر۔"

"شکریہ۔" انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا۔

"لیکن یہ ہوا کیا تھا؟" صدر جوناف کے منہ سے نکلا۔

"یہ تو پائلٹ ہی بتا سکتا ہے۔"

صدر صاحب نے سیٹ پر لگا بٹن دبایا۔ فوراً ہی ٹیلی فون کی قسم کا آلہ سیٹ کے بازو پر ابھرا اور صدر جوناف نے اس آلے میں کہا:

"ہیلو، یہ جھٹکا کیسا تھا؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آیا، ہم چیک کر رہے ہیں۔ آپ بے فکر ہو کر بیٹھیے۔" پائلٹ کی آواز ابھری۔

اسی وقت خدمت گار دوسرا گلاس لے آیا۔ انہوں نے گلاس اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ عین اسی وقت فرزانہ کی نظر قالین پر پڑی۔ سرخ رنگ کا قالین اس جگہ سے نیلگوں ہو گیا تھا، جس جگہ پانی گرا تھا۔ یہ دیکھتے ہی وہ کانپ اٹھی۔ اس نے لرزتی آواز میں کہا:

"ابا جان، یہ پانی پینے کی کوشش نہ کریں۔"

☆☆

انسپکٹر جمشید چونک اٹھے۔ ان کے ساتھ دوسرے بھی حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

"کیوں، اس پانی میں کیا ہے؟"

"پتا نہیں، لیکن یہ قالین کیوں نیلا ہو گیا ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" فرزانہ بولی۔

سب نے بوکھلا کر قالین کی طرف دیکھا اور پھر ان کے رنگ اڑ گئے، فوراً ہی وہ خدمت گار کی طرف مڑے۔ دوسرا لمحہ حیران کن تھا۔ دونوں خدمت گاروں کے ہاتھوں میں پستول چمک رہے تھے۔

"یہ سب کیا ہے؟" صدر جوناف نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

"اغوا۔ آپ کا اغوا۔ اب آپ اپنے وطن واپس نہیں جا رہے۔ جہاز ایک اور سمت میں پرواز کر رہا ہے۔ کل آپ کے ملک میں یہ خبر پھیلا دی جائے گی کہ صدر جوناف خفیہ طور پر ملک سے فرار ہو گئے۔ اس خبر سے آپ کی فوجوں کے چھکے چھوٹ جائیں گے۔ ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ جائیں گے، ادھر عوام کے پیروں تلے سے زمین نکل جائے گی اور جو فتح ہم مزید ایک ماہ کی لڑائی کے بعد حاصل کرتے، ایک دن میں حاصل کر لیں گے۔ ہماری فوجوں کا آپ کے ملک پر قبضہ بھی ہو جائے گا۔" خدمتگار مسکراتے ہوئے کہتا چلا گیا۔

"تت۔ تو۔ تو کیا تم۔ تم....؟" صدر جوناف ہکلائے۔

"ہاں، ہم چاروں آپ کے عملے کے میک اپ میں ہیں۔ آپ کے چاروں وفادار موت کے گھاٹ اتر چکے ہیں۔"

"میک اپ میں۔" انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا۔ اچانک ان کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ محمود، فاروق اور فرزانہ نے ان کا چہرہ اس طرح سیاہ پڑتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

انہوں نے سنا، صدر جوناف کہہ رہے تھے:

"مل۔ لیکن یہ سب کیسے ہو گیا؟"

"اس پورے منصوبے کی باگ ڈور ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں ہے جو حکومتوں کے تختے الٹنے میں بہت مہارت رکھتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ حکومتوں کے تختے الٹنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے اور اس نے اپنی یہ بات سچ ہی کر دکھائی۔ دیکھ لیجیے، کل تک آپ کی حکومت ختم ہو چکی ہوگی اور وہاں ہمارا قبضہ ہو چکا ہوگا۔ آپ نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا۔ اس وقت ہمارا پروگرام آپ لوگوں کو بے ہوش کرنے کا تھا۔ اس گلاس میں بے ہوشی کی دوا ملی ہوئی تھی۔"

"مجھے یقین نہیں آ رہا۔ ٹھہرو، پہلے میں پائلٹ سے بات کر لوں۔" یہ کہہ کر صدر جوناف نے پھر سیٹ پر لگا بٹن دباتے ہوئے کہا۔

"ہیلو پائلٹ، کیا تم اصل پائلٹ نہیں ہو؟"

"ہاں، یہ سچ ہے۔ آپ کو اغوا کیا جا چکا ہے۔ عنقریب آپ ہمارے قیدی ہوں گے۔" پائلٹ کی آواز ابھری۔

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ سب کے رنگ اڑے ہوئے تھے۔ پروفیسر داؤد اور خان رحمان بھی حد درجے فکر مند نظر آ رہے تھے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کا بھی برا حال تھا، البتہ انسپکٹر جمشید کا چہرہ ابھی تک سیاہ پڑا ہوا تھا اور یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ وہ اس حد تک فکر مند کیوں نظر آ رہے ہیں۔

"ابا جان، خیر تو ہے، ہمیں بے شک اغوا کر لیا گیا ہے، لیکن آپ اس حد تک خوف زدہ کیوں نظر آ رہے ہیں؟"

"میں خود بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ میں اتنا خوف زدہ کیوں ہو گیا ہوں۔" انہوں نے عجیب بات کہی۔ یہ الفاظ کہتے وقت بھی ان کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں

رینگی، حالانکہ مشکل حالات میں بھی وہ مسکرانا نہیں بھولتے تھے۔

"جمشید، تم تو کچھ زیادہ ہی سنجیدہ نظر آ رہے ہو۔ ایسی بھی کیا بات ہے۔ ہم پر تو ایسے لمحات آتے ہی رہتے ہیں۔" خان رحمان بول پڑے۔

"ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو خان رحمان، ہمیں واقعی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ مایوسی گناہ ہے۔ خدا کی ذات سے پوری پوری امید رکھنا چاہیے۔" اچانک ان کی مسکراہٹ لوٹ آئی۔ انہوں نے اس مسکراہٹ کو حیران ہو کر دیکھا۔ فاروق سے رہا نہ گیا، بول اٹھا:

"شاید آپ کی مسکراہٹ کہیں غائب ہو گئی تھی۔"

"شاید، تمہارا خیال ٹھیک ہے۔ خدا کا شکر ہے، یہ واپس مل گئی۔" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے آپ تھوڑی دیر پہلے فکر مند تھے ہی نہیں۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"چھوڑو اس ذکر کو پروفیسر صاحب، مجھے افسوس ہے۔ آپ ایک بار پھر میری وجہ سے مصیبت میں مبتلا ہو گئے، اور خان رحمان تم بھی۔"

"بھئی، اس میں افسوس ظاہر کرنے والی کیا بات ہے۔ یہ کونسی نئی بات ہے، یہ تو ہمارا معمول ہے۔" پروفیسر داؤد نے مسکرا کر کہا۔

"اور کیا، کیا ہم موت سے ڈرتے ہیں۔"

"اور صدر انکل، ہمیں بہت افسوس ہے۔ ہمارے ہوتے ہوئے آپ ان حالات میں پھنس گئے، لیکن آپ دیکھ ہی رہے ہیں، ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اگر ہم کسی طرح ان دو خدمت گاروں پر قابو بھی پا لیں، تو بھی انجن روم دوسری طرف سے بند کیا جا چکا ہے۔" فرزانہ صدر جوناف کی طرف مڑی۔

''تم۔ تم ٹھیک کہتی ہو بیٹی۔'' صدر صاحب ہکلائے۔

عین اسی وقت جہاز کو ایک اور جھٹکا لگا۔ اور انہوں نے محسوس کیا، جہاز نیچے اتر رہا ہے۔ انہوں نے کھڑکیوں میں سے نیچے جھانکا۔ جہاز ایک پہاڑی وادی میں اتر رہا تھا۔ عموی پہاڑ ان کا منہ چڑا رہے تھے۔

☆☆☆

پارسل لیتے جایئے

آصف نے دروازے پر دستک دی، فوراً ہی قدموں کی آواز سنائی دی۔ دروازہ کھلنے پر ایک لمبے قد کے آدمی کا چہرہ نظر آیا۔

''ہیلو، آپ کون لوگ ہیں؟'' اس کا انداز مذاق اڑانے والا تھا۔

''ہم وہ ہیں، جن کا پیکٹ آپ نے وصول کر لیا ہے اور اسے وصول کرنے کے لیے اچھا بھلا چکر چلایا گیا ہے۔ پیکٹ حاصل کرنے سے زیادہ تو ہم یہ جاننے کے لیے بے تاب ہیں کہ آخر اس پیکٹ کو اس طرح کیوں حاصل کیا گیا ہے۔'' آفتاب نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

''میں سمجھا نہیں، آپ کیا کہہ رہے ہیں۔'' لمبے آدمی نے حیران ہو کر کہا۔

''دیکھیے جناب، انجان بننے کی کوشش نہ کریں۔ ہمارا ایک پارسل آیا تھا، پوسٹ مین سے ایک جیب کترے نے اسے دو ہزار روپے دے کر حاصل کر لیا، کیونکہ اسے ایسا کرنے کے لیے ایک اور شخص نے کہا تھا، اس نے اسے چار ہزار روپے اس کام کے دیے تھے۔ ان میں سے اس نے دو ہزار روپے ڈاکیے کو دیے اور پارسل اس سے لے لیا۔ اس آدمی نے جیب کترے کو ایک کارڈ بھی دیا تھا۔ وہ کارڈ آپ کے نام کا تھا، یعنی اس پر انوار شام لکھا تھا۔ اس آدمی نے جیب کترے کو ہدایت کی کہ پارسل اس کارڈ کے پتے پر پہنچا دے۔ اور اس نے یہاں پہنچا دیا۔ اگر آپ اب بھی انکار کریں گے تو ہم اس جیب کترے کو بطور گواہ پیش کریں گے اور ساتھ ہی پولیس کو بھی

لائیں گے۔"

"وہ جیب کترا کہاں ہے، جس نے آپ لوگوں کو یہ کہانی سنائی ہے۔" انوار شام نے بُرا سا منہ بنایا۔

"کیوں، کیا اس نے ہمیں کوئی جھوٹی کہانی سنائی ہے۔" آفتاب چونک کر بولا۔

"ہاں، صاف ظاہر ہے کہ وہ آپ کو یہاں تک لایا ہے، لیکن اب آپ کو اس کا نام ونشان تک نہیں ملے گا۔"

"جی نہیں، وہ یہیں موجود ہے۔ سامنے درختوں کا جھنڈ دیکھ رہے ہیں، آپ؟"

"ہاں، دیکھ رہا ہوں۔ روز ہی دیکھتا ہوں۔" انوار شام کا انداز اب بھی مذاق اڑانے والا تھا۔

"تو وہ جیب کترا اس جھنڈ میں چھپا ہوا ہے۔"

"جائیے، پہلے جا کر اس گواہ کو لے آئیے، پھر مجھ سے بات کیجیے گا۔"

"آفتاب، جیب کترا۔" آصف بولا۔

"کیا کہا، میں جیب کترا۔" آفتاب نے تنک کر کہا۔

"نہیں، میں نے کہا ہے، ذرا جیب کترے کو بلا لاؤ۔"

"یہ اچھی بات ہے۔ جیب کتروں کو بلا کر لانے کے لیے میں ہی رہ گیا ہوں۔" اس نے پیچ و تاب کھا کر کہا اور جھنڈ کی طرف چلا گیا۔ نزدیک پہنچ کر اس نے کہا:

"ہیلو میاں، تم کہاں ہو۔" یہ کہہ کر اس نے ادھر ادھر دیکھا لیکن کوئی جواب نہ ملا، نہ جیب کترا کہیں دکھائی دیا۔

"ارے میاں جیب کترے، سامنے آ جاؤ۔ ہم تمہیں بطور گواہ پیش کرنا

چاہتے ہیں۔ وہ انوار صبح شام صاحب ہماری بات پر یقین ہی نہیں کر رہے ہیں۔" اس نے پھر ہانک لگائی۔ اب بھی کوئی جواب نہ ملا، تو وہ جھنڈ میں گھس گیا اور اسے ادھر ادھر تلاش کرنے لگا، لیکن وہ کہیں بھی نظر نہ آیا۔ آخر وہ واپس پلٹا۔

"اسے تو شاید جھنڈ کھا گیا ہے۔" ان کے نزدیک پہنچ کر اس نے کہا۔

"جھنڈ کھا گیا، تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔" آصف نے بھنا کر کہا۔

"یار، اگر زمین کھا سکتی ہے اور آسمان نگل سکتا ہے تو کیا جھنڈ نہیں کھا سکتا۔" اس نے بھی تلملا کر جواب دیا۔

"اچھا بھائی، کان نہ کھاؤ، چلو مان لیا۔ جھنڈ صاحب بھی کھا سکتے ہیں۔" آصف نے کہا۔

"میں نے کہا تھا نا کہ اس جیب کترے کا نام ونشان تک نہیں ملے گا۔ اس نے آپ لوگوں کو الو بنایا ہے۔"

"اوہ، خدا کا شکر ہے، کسی نے الو بھی بنایا۔ بہت دن ہو گئے تھے الو بنے۔" آفتاب بڑبڑایا۔

"کیا اوٹ پٹانگ ہانک رہے ہو، آؤ چلیں۔ اس جیب کترے کے بچے سے سمجھ لیں گے۔" آصف غصے میں آ گیا۔

"ارے ارے، ٹھہرو بھی۔ اس طرح جانا مناسب نہیں۔ اتنی دور سے آئے ہیں۔ آئیے، ایک ایک کپ چائے تو پی کر جائیے۔"

"جی نہیں شکریہ، ہم بے وقت چائے نہیں پیتے۔" فرحت نے منہ بنا کر کہا۔

"تو شربت کا ایک ایک گلاس پیتے جائیے۔"

"جی نہیں، ہم شربت بھی نہیں پیتے۔"

"اچھا تو اپنا پارسل لیتے جائیے۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"جی، کیا مطلب؟" تینوں چونک کر بولے۔

"ہاں، اپنا پارسل لیتے جائیے۔" اس نے پھر کہا۔

"یہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" آصف ہکلایا۔

"ہاں، اس جیب کترے نے غلط نہیں کہا تھا، لیکن جو پارسل ہم حاصل کرنا چاہتے تھے، اس کی بجائے وہ کوئی اور پارسل لے آیا۔ آئیے، میں آپ کو آپ کا پارسل دے دیتا ہوں۔"

اب تو وہ خوش ہو گئے۔ محنت بار آور ہوتی نظر آئی تھی۔ تینوں اس کے پیچھے اندر داخل ہوئے۔ کوٹھی بہت شاندار تھی۔ انوار شام انہیں ڈرائنگ روم میں لے آیا اور بولا:

"آپ لوگ تشریف رکھیے، میں پارسل لے کر ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ واپس مڑ گیا۔

"یار، یہ کیا چکر ہے؟" آصف بڑبڑایا۔

"خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ میں تو حیران ہوں کہ یہ چکر کیا صرف ہمارے ہی لیے رہ گئے ہیں۔"

"اور بے چارے جائیں بھی کہاں؟" فرحت مسکرائی۔

"کون بے چارے؟" آصف چونکا۔

"بے چارے چکر۔" آفتاب بولا۔

"بس ہو گئے شروع۔ ذرا موقع ملا نہیں اور تم دونوں شروع ہوئے نہیں۔" آصف نے بھنا کر کہا۔

"تمہیں کس نے منع کیا ہے۔ تم بھی ہمارا ساتھ دیا کرو، لیکن مصیبت تو یہ

ہے کہ تم پر تو ہر وقت کام کرنے کا بھوت سوار رہتا ہے۔" آفتاب نے اسے گھورا۔

اسی وقت قدموں کی چاپ ابھری۔ انوار شام اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پارسل تھا۔ اس پر سرخ رنگ کا کپڑا لپٹا ہوا تھا۔

"یہ ہے وہ پارسل، اسے کھول کر اپنا اطمینان کر لیجیے۔"

"لیکن جناب، سوال تو یہ ہے کہ آپ ایک غیر قانونی طریقے سے کسی کا پارسل کیوں حاصل کرنا چاہتے تھے؟"

"اس بات کو چھوڑیں۔ آپ کو آم کھانے سے غرض ہے یا پیڑ گننے سے۔ آپ کو آپ کا پارسل مل رہا ہے۔ یہی کیا کم ہے کہ اوپر سے آپ نے سوالات شروع کر دیے۔" اس نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"ہوں، بات تو ٹھیک ہے، ہمیں تو اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔" آصف نے جلدی سے کہا اور پارسل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ دل میں سوچ رہا تھا کہ باہر نکل کر اسی کوٹھی کی نگرانی شروع کریں گے۔ دیکھیں تو سہی، یہ انوار شام صاحب کرتے کیا ہیں۔

پارسل کا کپڑا بہت مضبوطی سے سلا ہوا تھا۔ آصف نے اسے ادھیڑنے کی کوشش شروع کر دی۔ آخر سلائی ادھڑنے لگی۔ پھر پارسل کا کپڑا اترا اور اس کے ساتھ ہی ایک ہلکا سا دھماکا ہوا جیسے کوئی بچہ کاغذ کے لفافے میں ہوا بھر کر اس پر زور سے ہاتھ مار دے۔ دھماکے کے ساتھ ہی ایک تیز بو ان کے نتھنوں میں گھسی اور وہ کرسیوں سے نیچے گر پڑے۔

☆☆

انسپکٹر کامران مرزا نے کوٹھی کے دروازے پر لگی تختی پر نظر ڈالی۔ انوار شام لکھا تھا۔ پھر انہوں نے دستک دی۔ آخر چند سیکنڈ بعد دروازہ کھلا اور ایک لمبے آدمی کا

چہرہ نظر آیا۔

"تینوں بچے کہاں ہیں؟" انہوں نے سرد آواز میں کہا۔

"تینوں بچے، کیا مطلب؟"

"دو لڑکے اور ایک لڑکی۔ اپنے ایک پارسل کے بارے میں معلوم کرنے یہاں تک آئے تھے۔ وہ کوٹھی میں بھی داخل ہوئے تھے۔ آپ اس بات سے انکار نہیں کر سکتے، کیونکہ آپ کے ایک پڑوسی چشم دید گواہ ہیں۔ ان کا نام کاملین خان انجم ہے۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے انہیں اندر داخل ہوتے دیکھا ہے۔"

"اچھا اچھا، آپ پارسل والے بچوں کی بات کر رہے ہیں۔ وہ تو یہاں واقعی آئے تھے۔ میں سمجھا تھا، شاید آپ ننھے منے بچوں کی بات کر رہے ہیں۔ وہ تو اچھے خاصے نوجوان تھے۔"

"جی ہاں، وہی۔ ہاں تو وہ کہاں ہیں۔"

"چلے گئے اپنا پارسل لے کر۔ ان کا پارسل غلطی سے یہاں آ گیا تھا۔"

"چلے گئے۔" ان کے منہ سے نکلا۔

"یہاں ان کا کیا کام تھا۔ پارسل مل جانے کے بعد بھلا وہ کیا کرتے؟"

"ہوں، اچھا شکریہ۔" یہ کہہ کر وہ مڑے اور کاملین خان انجم کے گھر کے دروازے پر پہنچے۔ وہ لان میں ٹہل رہا تھا۔

"آپ کے پڑوسی انوار شام کا بیان ہے کہ وہ تینوں اپنا پارسل وصول کرنے آئے ضرور تھے، لیکن پارسل لے کر چلے گئے۔"

"پارسل، کیسا پارسل؟"

"ملک کے مغربی حصے سے ان کے نام ایک پارسل آیا تھا، وہ غلطی سے یہاں پہنچ گیا، تینوں سراغ لگاتے ہوئے یہاں پہنچ گئے ہوں گے اور اب پارسل لے

کر واپس جا چکے ہیں۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے ہمارے لیے اتنی زحمت کی۔"

"کوئی بات نہیں جناب، یہ تو میرا فرض تھا، بلکہ میں اب شرم محسوس کر رہا ہوں کہ آپ کو بلاوجہ یہاں تک کھینچ لایا۔"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ نے بہت اچھا کیا، لیکن یہ تو بتایئے کہ آپ کو انوار شام کیوں پسند نہیں؟"

"اس شخص کے ہاں روزانہ عجیب و غریب لوگ آتے ہیں، میرا دل کہتا ہے کہ آنے والے جرائم پیشہ لوگ ہوتے ہیں۔"

"ہوں، اچھا جناب خدا حافظ۔" وہ بولے اور اس سے ہاتھ ملا کر مڑے ہی تھے کہ ایک لڑکی کی آواز نے ان کے قدم روک لیے:

"اگر میں غلطی نہیں کر رہی تو آپ انسپکٹر کامران مرزا ہیں۔"

انسپکٹر کامران مرزا چونک کر مڑے۔ کاملین خان انجم نے جلدی سے کہا:

"یہ میری بیٹی ہے جناب، آپ کے اور آپ کے بچوں کے کارناموں کی دیوانی۔"

"میں جانتی ہوں ابو، آپ انہیں کیا اطلاع دینے گئے تھے۔" لڑکی نے کہا۔

"ارے، صوفیہ! تم کیسے جانتی ہو؟" کاملین خان انجم نے حیران ہو کر کہا۔

"میں نے بھی انہیں اس کوٹھی میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اور پہچان بھی لیا تھا۔ اس وقت میں اپنے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھ کر اسکول کا کام کر رہی تھی، پھر میں نے آپ کو کار میں جاتے دیکھا، اور اب آپ انہیں لے کر آئے تھے۔ یہ سامنے والی کوٹھی تک گئے اور واپس آ گئے۔ کیا آپ آفتاب، آصف اور فرحت کو ساتھ لے کر

نہیں جائیں گے۔"

"ساتھ لے کر نہیں جاؤں گا، لیکن وہ تو پہلے ہی واپس جا چکے ہیں۔"

"جی، یہ کس نے کہہ دیا آپ سے؟"

"انوار شام نے ہی بتایا کہ وہ تینوں اپنا پارسل لے کر واپس جا چکے ہیں۔"

"کیا؟" صوفیہ نے بالکل آفتاب کے انداز میں کہا اور پریشانی کے عالم میں بھی انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

"ہاں، انہوں نے یہی بتایا ہے۔"

"لیکن جس وقت سے وہ تینوں انوار شام کی کوٹھی میں داخل ہوئے ہیں، میں اس وقت سے لے کر اب تک کھڑکی میں ہی بیٹھی رہی ہوں۔ میں نے انہیں باہر نکلتے نہیں دیکھا۔"

"کیا کہا، باہر نکلتے نہیں دیکھا۔"

"ہاں، میں نے ایک سیکنڈ کے لیے بھی انوار شام کی کوٹھی کے دروازے سے نظریں نہیں ہٹائیں، کیونکہ میں یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ یہ لوگ یہاں کیوں آئے ہیں۔"

"اوہ۔" انسپکٹر کامران مرزا دھک سے رہ گئے۔ پھر انہوں نے جلدی سے کہا۔

"آپ کے ہاں فون ہے؟"

"جی ہاں، ہے۔" کاظمین خان جلدی سے بولے۔

"مہربانی فرما کر آپ میں سے ایک اس کوٹھی پر نظر رکھے۔ دوسرے مجھے فون تک لے کر چلیں۔ جلدی کریں۔ میں شدید خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔" انہوں نے

گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آپ میرے ساتھ آئیے۔ الو، آپ دروازے پر ٹھہریے۔" صوفیہ نے جلدی سے کہا۔ انسپکٹر کامران مرزا اس کے پیچھے اندر کی طرف لپکے انہوں نے شاہد کو فون کیا، اسے ہدایات دیں اور پھر واپس پلٹے۔

"کوئی کوٹھی سے باہر تو نہیں نکلا؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی نہیں۔"

"اچھا تو آپ دونوں یہیں رہیے، میں انوار شام سے پھر بات کرتا ہوں۔ اگر میں اندر داخل ہوں اور آپ مجھے باہر نکلتا نہ دیکھیں تو میرے اسسٹنٹ شاہد کو بتا دیجیے گا۔"

"اچھی بات ہے۔" کاظمین خان انجم نے کہا۔

وہ انوار شام کی کوٹھی کی طرف لپکے۔ چند منٹ بعد ہی وہ دوبارہ دروازے کی گھنٹی بجا رہے تھے۔ انہوں نے جلد ہی قدموں کی آواز سنی اور پھر انوار شام کی صورت نظر آئی۔

"اوہو، آپ پھر آ گئے۔ اب کیا بات ہے۔" اس نے چونک کر پوچھا۔ انہیں اس کے چہرے پر ذرا بھی گھبراہٹ نظر نہیں آئی۔

"مجھے افسوس ہے، میں پھر آپ کو تکلیف دینے چلا آیا۔"

"کوئی بات نہیں جناب، فرمایئے، میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

"میرا نام تو آپ جانتے ہی ہیں، کام بھی جانتے ہیں، لہٰذا یہ بھی جان جایئے کہ میں دوبارہ کیوں آیا ہوں۔" انہوں نے عجیب انداز میں کہا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"مطلب یہ کہ میرے بچوں کو اپنے گھر میں کسی خاص مقصد کے تحت بند

کرنے والا ضرور مجھ سے بھی واقف ہوگا اور میرے دوبارہ آنے کا مطلب یہ ہے کہ مجھے آپ کی بات پر یقین نہیں آیا۔ حالات یہ کہہ رہے ہیں کہ آفتاب، آصف اور فرحت یہاں آئے ضرور ہیں، واپس نہیں گئے۔" وہ جلدی جلدی کہتے چلے گئے۔

"آفتاب، آصف اور فرحت۔ اچھا اچھا، یہ ان بچوں کے نام ہیں، جو اپنے پارسل کی تلاش میں آئے تھے۔"

"ہاں، اگر آپ کا ارادہ اسی طرح انجان بنے رہنے کا ہے، تو یہ بھی سُن لیں کہ میرا نام انسپکٹر کامران مرزا ہے۔"

"انسپکٹر کامران مرزا، یہ نام سنا ہوا تو لگتا ہے۔" اس کا انداز غصہ دلانے والا تھا۔

"خیر خیر، میں آپ کے گھر کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔ فوری طور پر۔" انہوں نے کہا۔

"تلاشی کے وارنٹ تو ہوں گے آپ کے پاس۔"

"میں ان تکلفات کا عادی نہیں۔ ملک بھر میں کسی بھی جگہ کی تلاشی بغیر وارنٹ کے لے سکتا ہوں۔" انہوں نے کہا۔

"یہ کس قانون کے تحت؟" اس نے حیران ہو کر کہا۔

انسپکٹر کامران مرزا نے اپنا خصوصی اجازت نامہ نکال کر دکھایا۔ اس نے اسے حیران ہو کر پڑھا اور پھر انہیں راستہ دیتے ہوئے بولا:

"تشریف لائیے جناب، واقعی آپ ہر گھر کی بغیر وارنٹ کے تلاشی لے سکتے ہیں۔"

وہ اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے دروازہ اندر سے بند کر کے چٹخنی لگا دی اور پھر ایک ایک کمرے کی تلاشی لینے لگے۔ آخر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ پورا

کمرہ ترتیب سے سجا ہوا تھا۔ کسی گڑبڑ یا بے ترتیبی کے آثار نہیں تھے۔ انہوں نے کمرے کی فضا میں دو تین گہرے سانس لیے اور پھر بولے:

"آپ نے انہیں اس کمرے میں بٹھایا تھا؟"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔" انوار شام بولا۔

وہ کمرے کے ایک ایک انچ کا جائزہ لینے لگے۔ قالین کو انہوں نے خوب ہی غور سے دیکھا اور پھر سیدھے ہوتے ہوئے بولے:

"میں اس کمرے میں وہ خوشبو تو سونگھ ہی رہا ہوں جو وہ تینوں لگانے کے عادی ہیں، لیکن یہاں اس کے علاوہ بھی ایک ہلکی سی بُو پھیلی ہوئی ہے۔ امونیا قسم کی گیس کی بُو، جو ابھی مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی۔ اگرچہ کمرے کے تمام دروازے اور کھڑکیاں آپ نے کھول دیے ہیں۔ اس کا مطلب ہے، انہیں اسی کمرے میں بے ہوش کیا گیا ہے۔"

"جی، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" "آپ کو ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ وہ یہاں سے اپنا پارسل لے کر جا چکے ہیں۔"

"مجھے اس بات پر یقین نہیں، بلکہ میں جانتا ہوں، وہ یہاں سے اپنے پاؤں پر چل کر ہرگز نہیں گئے۔ انہیں یہاں سے اٹھا کر ادھر ادھر کیا گیا ہے۔ مسٹر انوار شام آپ نے جو کھیل کھیلا ہے، وہ آپ کے لیے بھی کم خطرناک ثابت نہیں ہوگا۔ میرا نام انسپکٹر کامران مرزا ہے، اگر آپ مصیبت سے بچنا چاہتے ہیں تو فوری طور پر بتا دیں، بچے کہاں ہیں؟"

"وہ پارسل لے کر جا چکے ہیں۔" اس نے بُرا سا منہ بنایا۔

"اچھی بات ہے، کیا اس وقت گھر میں آپ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے؟"

"جی نہیں، میں یہاں بالکل تنہا رہتا ہوں۔"

''اور آپ کے دوست آپ سے روزانہ ملنے آتے ہیں۔''

''کیا یہ غیر قانونی بات ہے؟''

''بالکل قانون کے مطابق ہے، لیکن بچوں کو بے ہوش کر کے ادھر ادھر کرو یا بہت غیر قانونی بات ہے۔''

''آپ زبردستی ایک جرم میرے سر تھوپنا چاہتے ہیں تو اس کا میرے پاس کیا علاج ہے۔'' اس نے بھنا کر کہا۔

''بہت جلد آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ آپ کہاں کھڑے ہیں۔'' انسپکٹر کامران مرزا بولے۔ انہیں اس شخص پر بے تحاشا غصہ آ رہا تھا۔ لیکن وہ اپنے غصے کو دباتے چلے جا رہے تھے۔ آخر دروازے کی گھنٹی بجی۔

انسپکٹر کامران مرزا انوار شام کے ساتھ ہی دروازے تک آئے۔ سب انسپکٹر شاہد اپنے ماتحتوں کے ساتھ آ گیا تھا۔

''کوٹھی کو چاروں طرف سے گھیرے میں لیا جا چکا ہے جناب۔'' اس نے دروازہ کھلتے ہی کہا۔

''ٹھیک ہے، اب ان کی تمام دیواریں اور فرش ٹھوک بجا کر دیکھ لو۔ الماریوں کا جائزہ بھی بہت اچھی طرح لینا ہے۔ اس امکان کا جائزہ بھی لینا ہے کہ کوٹھی کے نیچے کوئی تہ خانہ تو نہیں ہے اس بات کا یقین کر لو کہ یا تو اس کوٹھی کا کوئی تہ خانہ ہے یا باہر نکلنے کا کوئی خفیہ راستہ ہے۔ خفیہ راستہ کوٹھی کے پچھلے حصے میں نکل سکتا ہے۔ اگلے حصے میں نہیں اور دو آدمی مسٹر انوار شام کو اپنی نگرانی میں رکھیں۔ یہ ادھر ادھر بھاگنے نہ پائیں۔''

''بھلا مجھے بھاگنے کی کیا ضرورت ہے، جب میں نے کوئی جرم ہی نہیں کیا۔''

''کچھ لوگ جرم بہت سوچ سمجھ کر کرتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ہرگز پکڑے نہیں جائیں گے، لیکن یہ ان کی خام خیالی ہوتی ہے۔ کیونکہ جرم چھپ نہیں سکتا۔''

یہ کہہ کر وہ خود بھی انوار شام کے پاس سے ہٹ گئے اور کوٹھی کی دیواروں، الماریوں اور فرشوں کا خود بھی جائزہ لینے لگے۔ ان کی پریشانی میں ہر لمحے اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا، کیونکہ اگر وہ اس کوٹھی میں کوئی تہ خانہ یا خفیہ راستہ تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو معاملہ حد درجے خطرناک صورت اختیار کر جاتا۔ اچانک انہیں کچھ خیال آیا۔ وہ فون کے پاس آئے اور گھر کے نمبر ڈائل کرنے کے بعد بولے:

''ہیلو بیگم، تینوں ابھی تک لوٹے تو نہیں؟''

''جی نہیں، اس کا مطلب ہے، وہ ابھی آپ کو نہیں ملے۔'' شہناز بیگم پریشان آواز میں بولیں۔

''نہیں، لیکن فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں بہت جلد انہیں ساتھ لے کر گھر لوٹوں گا۔'' انہوں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

اب اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی کہ صوفیہ کا بیان غلط نہیں تھا۔ ایک بار پھر انہوں نے پورے جوش و خروش کے ساتھ تلاشی شروع کر دی اور آخر کار ایک الماری نے ان کے قدم جکڑ لیے۔ یہ الماری سوٹ ٹانگنے کی تھی اور انسانی قد کے برابر تھی۔ کوٹھی میں اس جیسی کوئی اور الماری انہیں نظر نہیں آئی تھی۔ اس کے پٹ کھولے، وہ کافی دیر تک دیکھتے رہے، پھر سوٹ نکال کر باہر ڈال دیے اور الماری کے تختوں کا جائزہ لینے لگے۔ انہیں ہر طرف دبا کر بھی دیکھا، پھر جیب سے چابیوں کا ایک گچھا نکال کر اس میں سے ایک لمبی سی چابی منتخب کی اور اس الماری کے نچلے تختے کی درز میں اڑا کر زور لگایا۔ دوسرا لمحہ چونکا دینے والا تھا۔ تختہ خود بخود اوپر اٹھ گیا اور ایک خلا نظر آنے

لگا۔ چھوٹی چھوٹی سیڑھیاں نیچے جاتی نظر آ گئیں۔ ان پر جوش کی کیفیت طاری ہوگئی۔ وہ بے دھڑک خلا میں اتر گئے۔ سیڑھیاں اترتے نیچے پہنچے۔ یہ کوئی تہ خانہ نہیں تھا، البتہ زیر زمین ایک راستہ ضرور تھا۔ ان کی جیب میں اگر پنسل ٹارچ موجود نہ ہوتی تو اس وقت انہیں کچھ بھی نظر نہ آتا۔ اس کے سہارے وہ آگے بڑھتے چلے گئے۔ یہ کافی لمبا راستہ ثابت ہوا اور پھر انہوں نے تازہ ہوا کا ایک جھونکا محسوس کیا۔ شاید راستہ ختم ہونے والا تھا۔ چند اور قدم اٹھانے کے بعد انہیں راستے کا دہانہ نظر آ گیا۔ وہ باہر نکل آئے۔ انہوں نے دیکھا، وہ گھنے جنگل میں کھڑے تھے۔ سورج آسمان پر پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا۔ آفتاب، آصف اور فرحت کا دور دور تک پتا نہیں تھا، البتہ دہانے کے پاس قدموں کے کئی نشانات ضرور نظر آئے۔ ان نشانات میں ان تینوں کے علاوہ بھی تین جوتوں کے نشانات تھے، گویا ان تینوں کو اسی راستے سے لے جایا گیا تھا۔ انہوں نے دہانے کی طرف دیکھا، وہ جھاڑیوں میں کچھ اس طرح گھرا ہوا تھا کہ نزدیک آ کر دیکھنے والے بھی صرف یہی خیال کر سکتے تھے کہ یہ ضرور کسی جانور کا بھٹ ہے۔ یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ یہ راستہ کوٹھی سے اندر ہی اندر فرار ہونے کا ہے۔ اس راستے کی موجودگی میں انوار شام کی گرفتاری آسان ہو گئی تھی۔ اب وہ سزا سے کسی صورت نہیں بچ سکتا تھا۔ یہ سوچ کر وہ واپس پلٹے اور خفیہ راستے کی بجائے جنگل سے ہوتے ہوئے کوٹھی کی طرف بڑھنے لگے۔ اچانک انہوں نے دوڑتے قدموں کی آواز سنی۔ انہوں نے چونک کر سامنے دیکھا، ان سے کچھ فاصلے پر کوٹھی کے مخالف سمت میں انوار شام بھاگا جا رہا تھا۔ اس کے پیچھے انہیں کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ اسے اس طرح بھاگتے دیکھ کر وہ بھی فوراً پلٹے اور اس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ انوار شام نے بھی اپنے پیچھے قدموں کی آواز سن لی اور تیزی سے مڑ کر دیکھا، ساتھ ہی اس کی رفتار میں اور اضافہ ہو گیا۔ انسپکٹر کامران مرزا نے کئی لمبی لمبی چھلانگیں لگائیں، لیکن اس

تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ کم بخت بہت تیز دوڑ رہا تھا۔ انہیں اس کی رفتار پر بہت حیرت ہوئی، تاہم انہوں نے بھی پیچھا نہ چھوڑا اور برابر دوڑتے رہے۔ شاہد اور اس کے ماتحتوں کا کہیں پتا نہیں تھا۔ نہ جانے یہ ان کے قبضے سے کس طرح نکل آیا تھا۔ اب جنگل میں چٹانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اچانک انہوں نے انوار شام کو گرتے دیکھا۔ درمیانی فاصلہ ابھی کافی تھا۔ انہوں نے اسے گر کر اٹھتے نہیں دیکھا۔ جب وہ نزدیک پہنچے تو دھک سے رہ گئے۔ چند سیکنڈ کے لیے تو ان کے حواس ہی گم ہو گئے، کیونکہ انوار شام جس جگہ گرا تھا، وہاں نہیں تھا۔ آس پاس بھی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ انہیں چکر سا آ گیا، پھر انہوں نے خود کو سنبھالا اور بغور اس جگہ کا جائزہ لینا شروع کیا، جہاں اسے گرتے دیکھا تھا۔ آخر کار چند قدم کے فاصلے پر انہیں ایک دراڑ نظر آئی۔ لڑھک کر اس دراڑ تک پہنچنا کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ انوار شام ضرور لڑھک کر اس دراڑ تک پہنچ گیا ہوگا۔

یہ سوچ کر وہ محتاط انداز میں آگے بڑھے اور دراڑ میں اتر گئے۔ ان کا خیال تھا کہ انوار شام دراڑ میں کہیں چھپ گیا ہوگا۔ لیکن جب وہ دراڑ میں اترے تو معلوم ہوا، دراڑ کا سلسلہ تو نہ جانے کہاں تک چلا گیا ہے۔ وہ تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ ان کا دل اب تیزی سے دھڑکنے لگا تھا، کیونکہ یہ معاملہ ہر لمحے الجھتا ہی جا رہا تھا۔ ایک سیدھا سادا معاملہ حد درجے پیچیدگی اختیار کر گیا تھا۔ آفتاب، آصف اور فرحت تو اپنے پارسل کی تلاش میں نکلے تھے۔ انوار شام کو انہیں غائب کرا دینے کی ایسی کیا ضرورت پڑ گئی تھی۔ یہ بات ان کی سمجھ میں کسی طرح بھی نہیں آ رہی تھی۔ تقریباً چودہ منٹ تک دراڑ میں اترتے رہنے کے بعد وہ نہ جانے کتنی گہرائی میں پہنچ گئے۔ انہیں اس دراڑ پر بھی حیرت ہو رہی تھی۔ جوں جوں وہ نیچے اتر رہے تھے۔ دراڑ کشادہ ہوتی جا رہی تھی اور اب وہ سوچ رہے تھے، اس دراڑ میں تو پوری فوج چھپائی جا سکتی ہے۔

اچانک کوئی چیز ان کے اوپر آ گری۔ انہوں نے اس سے بچنے کے لیے نہایت پھرتی سے چھلانگ بھی لگائی، لیکن بچ نہ سکے۔ اس چیز کے گرنے کا احساس انہیں ایک آدھ سیکنڈ کی تاخیر سے ہوا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ دھڑام سے گرے۔ اس وقت انہیں معلوم ہوا کہ ان پر گرنے والی چیز ایک جال تھا۔ کتنی ہی دور وہ لڑھکتے چلے گئے۔ پھر انہیں ایک زوردار جھٹکا لگا۔ کسی نے جال کی رسی کھینچ لی تھی۔ ان کا لڑھکنا رک گیا۔ وہ جال میں لٹکنے لگے، کیونکہ جال کی رسی کسی جگہ اونچائی پر کس دی گئی تھی۔ ساتھ ہی انہوں نے کسی کو کہتے سنا:

”بہت خوب انوار شام، تم نے اپنا پارٹ بخوبی ادا کیا۔“

ان الفاظ کے ساتھ ہی ایک تیز بُو ان کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ انہیں فوراً یاد آ گیا کہ اس قسم کی بُو انہوں نے انوار شام کے ڈرائنگ روم میں بھی محسوس کی تھی۔ دوسرے ہی لمحے ان کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

معزز قیدی

”ابا جان، ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔“ فرزانہ نے دبی آواز میں کہا۔

”یہ تمہاری سمجھ کو کیا ہوا۔ جب دیکھو، ایک بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔“ فاروق نے منہ بنایا۔

”کیا مطلب، سمجھ کی سمجھ میں۔“ محمود نے حیران ہو کر کہا۔

”ہاں، کون سی بات؟“ انسپکٹر جمشید ان دونوں کی بات پر توجہ دیے بغیر بولے۔ وہ بدستور نیچے دیکھ رہے تھے۔ جہاز اب پہاڑوں سے نیچے پرواز کر رہا تھا اور بہت دور نیچے انہیں چند آدمی کھڑے نظر آ رہے تھے۔ وہ ہاتھ ہلا ہلا کر گویا جہاز کے پائلٹ کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ صدر صاحب اور انہیں اس لیے نہیں کہ وہ تو اب قیدی تھے۔

”ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ کا چہرہ یکدم سیاہ کیوں پڑ گیا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی ایسا ہوتے نہیں دیکھا۔“

”ہاں، یہ اس وقت کی بات ہے، جب ان دونوں خدمتگاروں نے بتایا تھا کہ یہ صدر صاحب کے خدمت گاروں کے میک اپ میں ہیں۔ یہ الفاظ سُن کر میرا چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا۔“ انہوں نے کہا۔

”تو اس میں عجیب بات کیا ہے۔“ فاروق نے فرزانہ کو گھورا۔

"ایسے حالات میں تو ہم نہ جانے کتنی مرتبہ گھر چکے ہیں۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔" فرزانہ نے جواب دیا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو فرزانہ۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"تو پھر شاید دوست ملک کی تباہی کے خیال سے ایسا ہوا ہوگا۔" محمود نے خیال ظاہر کیا۔

"تم کیا کہتی ہو فرزانہ؟" وہ عجیب سے انداز میں مسکرائے۔

"میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔" فرزانہ نے الجھے ہوئے انداز میں کہا۔

"تو پھر تمہارے خیال میں آخر کیسا ہے؟" فاروق نے جھنجلا کر پوچھا۔

"میں کچھ سمجھ نہیں پا رہی۔ میرا ذہن الجھتا جا رہا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے ابا جان کسی خاص وجہ سے فکر مند ہیں۔" اس نے یہ الفاظ بہت دھیمی آواز میں کہے۔

"فرزانہ، تمہارے یہ الفاظ سن کر مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی کیا مطلب۔ اس فکر اور پریشانی کے عالم میں آپ فرزانہ کے الفاظ سن کر خوش ہو رہے ہیں۔ حیرت ہے، مجھے تو ان الفاظ میں کوئی ایسی بات محسوس نہیں ہوئی۔" فاروق نے کہا۔

"وہ اس لیے کہ تم میں عقل سے کام لینے کی عادت نہیں ہے۔" فرزانہ نے کہا۔

"اچھا بس خاموش، جہاز اب زمین کو چھونے ہی والا ہے۔ نہ جانے ہم اب کس ملک کی سرزمین پر ہیں، بہرحال اتنا سن لو کہ یہ چکر کچھ گہرا معلوم ہوتا ہے۔"

انسپکٹر جمشید نے گویا انہیں ڈانٹا۔

"کچھ گہرا، بہت گہرا۔"

"فی الحال تو کچھ ہی گہرا سمجھ لو۔ آگے چل کر نہ جانے کیا صورت اختیار کر جائے۔"

"یا اللہ رحم، یہ چکر صرف ہمارے لیے ہی رہ گئے ہیں۔" فاروق بولا۔

"اور ادھر آفتاب، آصف اور فرحت پارسل کے چکر میں چکرا رہے ہوں گے۔" محمود مسکرایا۔

"میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی۔ صدر صاحب کے عملے کی جگہ ان سازشیوں نے تو پہلے ہی لے لی تھی۔ پھر انہوں نے انہیں اسی وقت ہی کیوں اغوا نہ کر لیا، جب یہ اپنے ملک سے اڑے تھے۔ اغوا کے لیے ہمارے ملک سے واپس لوٹنے کا انتظار کیوں کیا گیا۔" فرزانہ سوچ میں گم لہجے میں بولی۔

"اسی لیے میں نے کہا تھا کہ مجھے تمہاری باتیں سن کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔" انسپکٹر جمشید نے سرگوشی کی۔

"انہوں نے سوچا ہوگا۔ مفت میں دو چار قیدی اور ہاتھ لگ جائیں گے اور کچھ نہیں تو قیدی صدر صاحب کی خدمت کرنے کے ہی کام آ سکیں گے۔" فاروق نے جواب دیا۔

"گویا انہوں نے سوچا تھا۔ مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے۔" محمود نے کہا۔

"لیکن میں ایسا نہیں سمجھتی۔"

"تمہارے سمجھنے نہ سمجھنے سے کیا فرق پڑتا ہے، کیونکہ جہاز زمین کو چھو چکا ہے اور اب کوئی دم میں ہمیں جہاز سے اترنا ہوگا۔ دیکھیں یہاں ہمارے ساتھ کیا ہوتا ہے۔"

جوں ہی جہاز رکا، ایک تیز گونج دار آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

''معزز قیدی کو خوش آمدید۔ ہم آپ کی آمد کے بے چینی سے منتظر تھے۔ یہاں آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔'' ان الفاظ کے ساتھ ہی جہاز کا دروازہ کھلا، آواز پھر آئی۔

''ہاتھ سروں سے بلند رکھتے ہوئے آپ لوگ نیچے اتر آئیں۔ کسی قسم کی حرکت کرنے کی کوشش کا نتیجہ صرف اور صرف موت کی صورت میں نکلے گا۔''

انہوں نے ہاتھ سروں سے بلند کر لیے۔ سب سے آگے صدر جوناف چلے، ان کے پیچھے باقی لوگ۔ دروازے سے نکل کر سیڑھی کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے انہوں نے دیکھا، نیچے چند غیر ملکی کھڑے تھے، لیکن ان کے چہروں مہروں سے یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ یہ کس ملک کے ہیں۔ کم از کم یہ صدر جوناف یا ان کے ملک کے نہیں تھے۔

وہ ایک قطار کی صورت میں کھڑے تھے۔ ان کے لباس دھوپ کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ ان کی پیٹیوں میں پستول اڑسے ہوئے تھے۔ انہوں نے شاہانہ انداز میں صدر جوناف کو سلوٹ کیا۔ شاید وہ ان کا مذاق اڑا رہے تھے، پھر سلوٹ کرنے والوں میں جو سب سے آگے کھڑا تھا۔ آگے بڑھا اور بولا:

صدر صاحب کو اندر کنویں میں قید کیا جائے گا اور ان لوگوں کو اس وادی کا قیدی بنا دیا جائے گا۔ جب تک یہ لوگ اس وادی سے خوراک حاصل کرتے رہیں گے، زندہ رہیں گے، اس کے بعد سسک سسک کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر بے بسی کی موت مر جائیں گے۔ رہے صدر جوناف، تو اندھے کنویں میں خوراک کا کیا کام۔ یہ تو آج سے ہی ایڑیاں رگڑنا شروع کر دیں گے اور کل صبح ان کے ملک کی فوج ہتھیار ڈال دے گی۔ ان لوگوں کے ہتھیار لے لیے جائیں۔''

اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی آٹھ دس آدمی آگے بڑھے۔ اور ان کے ہتھیار اپنے قبضے میں کر کے پیچھے ہٹ گئے۔

''صدر جوناف کو ان کی آخری آرامگاہ پہنچا دیا جائے اور ان لوگوں کو وادی کے دوسری طرف پہنچا دیا جائے تا کہ یہ جلد اس کنویں کا سراغ نہ لگا سکیں۔ اگر انہوں نے کنویں کا سراغ لگا لیا تو یہ صدر جوناف کو بچانے کی کوشش کریں گے۔ اگرچہ ہمیں معلوم ہے کہ یہ انہیں اس کنویں سے نہیں نکال پائیں گے، پھر بھی ہمیں یہی ہدایت ملی ہے کہ ان لوگوں کو کسی قابل بھی نہ رہنے دیا جائے۔ یہی بہتر ہے۔''

فوراً ہی چار آدمیوں نے صدر جوناف کو گھیرے میں لے لیا۔ ان کا چہرہ لٹک گیا تھا۔ برسوں کے بیمار دکھائی دے رہے تھے۔ تقریباً دس آدمی ان کی طرف بڑھے اور انہیں ایک سمت میں چلنے کا اشارہ کیا۔ مرتے کیا نہ کرتے، چل پڑے۔ صدر صاحب کو ان کے مخالف سمت میں لے جایا جا رہا تھا۔ ان کا درمیانی فاصلہ بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ صدر صاحب نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

''ابا جان، کیا ہم اب کبھی صدر صاحب کو نہیں دیکھ سکیں گے۔'' محمود نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''تم اپنی خیر مناؤ، ان لوگوں کے ارادے ٹھیک نہیں ہیں۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

''یہ کہ یہ وادی ہمارے لیے موت کی وادی ثابت ہوگی۔ اس سے نکلنا تقریباً ناممکن ہے اور پھر صدر جوناف کے بغیر نکلنا ہمارے لیے ویسے بھی مر جانے کے برابر ہوگا، لہٰذا تم سوچ ہی سکتے ہو۔''

''ابا جان، کیا آپ مایوس ہو چلے ہیں۔''

"نہیں، مایوس ہونا تو خیر میں نے نہیں سیکھا۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہ ہم مر جائیں گے۔ لیکن اس وقت بھی مایوسی ہمارے پاس نہیں پھٹک سکتی، کیا سمجھے؟"

"ان شاء اللہ۔" تینوں نے ایک ساتھ کہا۔

وہ بہت دیر تک ہاتھ اوپر اٹھائے چلتے رہے۔ آخر پہاڑوں تک پہنچ گئے۔ انہوں نے سر اوپر اٹھائے۔ بالکل سیدھے پہاڑ، گویا آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔

"تم لوگ یہیں کھڑے رہو گے۔ اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرو گے، جب تک کہ جہازوں کو پرواز کرتے نہ دیکھ لو۔"

"جہازوں کو، تو کیا یہاں اور جہاز بھی ہے۔"

"ہاں، جس جہاز پر ہم آئے تھے، وہ بھی اڑے گا اور صدر جوناف والا بھی۔ اس کے بعد تم لوگ اپنی جگہ سے ضرور حرکت کر سکتے ہو، لیکن اگر اس سے پہلے تم نے ایسا کرنے کی کوشش کی تو تمہارے سروں پر گولیوں کی بوچھاڑ ہو سکتی ہے، کیونکہ دونوں جہازوں پر فائرنگ کا مکمل انتظام ہے۔"

"تم لوگ آخر چاہتے کیا ہو؟"

"جو چاہتے تھے، وہ تو ہو بھی گیا ہے۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ اور اپنے ساتھیوں کو واپس چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے مڑ گیا۔ وہ انہیں جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔

"کیا خیال ہے انسپکٹر جمشید، ہم ان پر حملہ نہ کر دیں۔" خان رحمان نے کہا۔

"اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ہم ان سب کو تو شاید ختم کر دیں، لیکن جہازوں تک پھر بھی نہیں پہنچ پائیں گے۔ ہمارے نزدیک پہنچنے سے پہلے ہی وہ جہاز کو اڑا لیں گے اور ہم پر گولیوں کی بارش کر دیں گے۔ میں اس حالت میں ہرگز واپس جانا

نہیں پسند کرتا کہ ہم میں سے کوئی کم ہو جائے۔ آخر میں دوسروں کو کیا جواب دوں گا جا کر۔"

"تمہارا خیال بالکل ٹھیک ہے جمشید، ہمیں ان کی واپسی تک صبر کر کے کھڑے رہنا چاہیے۔ جب یہ لوگ چلے جائیں گے۔ اس وقت ہم دیکھیں گے کہ کیا کیا جا سکتا ہے اور کیا نہیں۔"

"میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہاں کچھ کیا ہی نہیں جا سکتا۔" محمود بولا۔

"بالکل غلط۔ کم از کم ہم گھوم پھر تو سکتے ہی ہیں۔"

"اور گھاس بھی چر سکتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"ویسے میرا خیال ہے جمشید، تم جہاز میں فرزانہ کا سوال گول کر گئے تھے۔ شاید تم نے اس لیے جواب نہیں دیا تھا کہ دشمن پستول لیے سر پر کھڑے تھے۔" اچانک پروفیسر داؤد بولے۔

"اوہو، تو آپ بھی یہ باتیں سن رہے تھے۔" انسپکٹر جمشید چونکے۔

"ہاں، میں بھی اور خان رحمان بھی۔ ہم دونوں کا خیال یہ ہے کہ تم ضرور کچھ چھپا رہے ہو۔"

"یہ ٹھیک ہے، لیکن مہربانی فرما کر مجھ سے یہ پوچھنے کی کوشش نہ کیجیے گا کہ میں کیا چھپا رہا ہوں۔" انہوں نے کہا، محمود، فاروق اور فرزانہ نے انہیں چونک کر دیکھا، پھر ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"کیا مطلب؟"

☆☆

چند لمحے تک وہ سب انسپکٹر جمشید کو گھورتے رہے۔ آخر انہوں نے ہی مسکراتے ہوئے کہا:

"اس فکر میں پڑنے کی بجائے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ وہ اندھا کنواں کہاں ہے اور یہ کہ ہم صدر جوناف کو اس کنویں سے کس طرح نکال سکتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ اس وادی سے نکلنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔"

"لیکن ابا جان، یہ سب تو ہم اس وقت کریں گے، جب ان کے جہاز پرواز کر جائیں گے۔ ابھی ہم نے جہازوں کی آواز نہیں سنی۔ ویسے کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس مرتبہ ہمارے ساتھ ہوا کیا ہے۔" محمود نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں، کیوں نہیں۔ یہ کیا مشکل ہے۔ اس مرتبہ ہمیں اغوا کیا گیا ہے۔" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ ہم صدر صاحب کی وجہ سے مارے گئے یا صدر صاحب ہماری وجہ سے مارے گئے۔" محمود نے نئی بات کہی۔

"کیا مطلب؟" فرزانہ چونکی۔

"میں نے ایسے مشکل الفاظ تو استعمال نہیں کیے کہ تم مطلب جاننے پر اتر آئیں۔"

"ہاں اور کیا اتر نا ہی تھا تو کسی سیارے پر اتری ہوتیں۔" فاروق بولا۔

"تمہاری بات سیدھی سادی ضرور ہے، لیکن اس کے باوجود اس میں گھماؤ پھراؤ ہے۔" فرزانہ نے محمود کو گھورا۔ فاروق کا جملہ تو جیسے اس نے سنا ہی نہیں۔

"تو پھر تمہیں چاہیے، تم ابا جان کے جواب کا انتظار کرو۔"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے، لیکن میں محمود کے سوال کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھتا۔ صاف نظر تو یہی آتا ہے کہ صدر صاحب کی وجہ سے اس مصیبت میں پھنسے ہیں۔"

"یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آئی کہ صدر صاحب کو اندھے کنویں میں کیوں

ڈلوایا گیا ہے، اور ہمیں وادی میں آزاد کیوں گھومنے کے لیے چھوڑ دیا۔ کیا صدر صاحب اس وادی سے نکل جاتے۔" محمود نے کہا۔

"میرا خیال ہے، تم بھی کچھ عقل استعمال کر رہے ہو۔"

"بس ایک میں ہی رہ گیا ہوں، جو عقل استعمال نہیں کر رہا۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ میں بچت کے فارمولے پر عمل کر رہا ہوں۔ جب ان دونوں کے پاس عقل کا ذخیرہ ختم ہو جائے گا تو اس وقت میری بچت کام آئے گی۔" فاروق نے شوخ لہجے میں کہا۔

"وحشت تیرے کی۔ تم اپنی ٹانگ بیچ میں ضرور اڑا دیا کرو۔ مارے۔" آخر میں اس نے چونک کر کہا۔

اسی وقت جہازوں کے انجن تیز آواز میں چلے تھے، پھر انہوں نے جہازوں کو اوپر اٹھتے دیکھا۔

"لیجیے، اب ہم حرکت کرنے کے لیے آزاد ہیں۔"

"تو پھر مختلف سمتوں میں پھیل جاؤ اور اندھے کنویں کی تلاش شروع کر دو۔ ہم جس قدر جلد کنویں کو تلاش کر لیں، اچھا ہے۔ اس صورت میں صدر جوناف کی زندگی بچنے کی امید کی جا سکتی ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"محمود، میرے ساتھ آؤ۔" فرزانہ نے جلدی سے کہا۔

"ٹھیک ہے، اس طرح ہمیں فاروق سے نجات مل جائے گی۔" محمود نے فوراً کہا۔

"خان رحمان، تم میرے ساتھ آؤ۔" انسپکٹر جمشید ہنس کر بولے۔

فاروق نے پروفیسر داؤد کی طرف اور انہوں نے اس کی طرف دیکھا، پھر فاروق چہک کر بولا۔

www.urdukorner.com

"انکل، میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ آپ کو بور نہیں ہونے دوں گا۔"

"میرا ابھی یہی خیال ہے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

اور یہ تینوں پارٹیاں تین مختلف سمتوں میں نکل کھڑی ہوئیں۔ محمود اور فرزانہ نے اس طرف کا رخ کیا تھا، جس طرف انہوں نے صدر جوناف کو لے جاتے دیکھا تھا۔

"اگر کنواں ہم نے تلاش کر لیا تو فاروق اپنا سا منہ لے کر رہ جائے گا۔" فرزانہ نے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اور پروفیسر انکل۔" محمود نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"انہیں اپنا سا منہ لے کر رہ جانے کی کیا ضرورت۔ وہ کوئی بچے تھوڑا ہی ہیں۔"

"لیکن یہ نہ بھولو کہ دوسری طرف ابا جان اور انکل خان رحمان ہیں ہمارے مقابلے پر۔ یہ پارٹی ہمارے مقابلے میں کسی طرح بھی کمزور نہیں ہے۔" محمود نے کہا۔

"یہ تو خیر ٹھیک ہے، بہر حال کوشش کرنا فرض ہے۔"

وہ اندھے کنویں کی تلاش میں وادی کے آخری سرے تک چلے گئے۔ عمودی پہاڑ اب ان کے سامنے تھے اور ان کے لیے واپس پلٹنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

ادھر فاروق پروفیسر داؤد سے کہہ رہا تھا:

"انکل، کبھی آپ کو پہلے بھی اندھا کنواں تلاش کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔"

"نہیں تو، تم نے یہ کیوں پوچھا؟" پروفیسر داؤد حیران ہو کر بولے۔ ساتھ ساتھ دونوں آگے قدم بھی اٹھا رہے تھے۔

"اچھا یہ بتایئے، کوئی ایسا کنواں تلاش کرنے کا اتفاق ہوا ہے، جو اندھا نہ ہو۔ یعنی آنکھوں والا ہو۔"

"آنکھوں والا کنواں۔" پروفیسر داؤد نے آنکھیں نکالیں۔

"ہم، میرا مطلب ہے، جو اندھا کنواں نہ ہو۔"

"نہیں، میں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی بھی قسم کا کوئی کنواں تلاش نہیں کیا۔" انہوں نے منہ بنایا۔

"پھر تو مشکل ہے انکل۔"

"کیا مشکل ہے؟" وہ حیران ہو کر بولے۔

"یہ کہ ہم وہ کنواں تلاش کر سکیں۔"

"کیوں، تم جو میرے ساتھ ہو۔"

"لیکن میرے لیے بھی کوئی اندھا کنواں تلاش کرنے کا یہ پہلا موقع ہے۔" اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا، پھر چونک کر بولا۔

"ہاں، بزرگوں سے یہ ضرور سنا ہے کہ کنواں تلاش کرنے کا اصول یہ ہے کہ آدمی ناک کی سیدھ میں چلتا رہے۔"

"لیکن۔ لیکن ہم ناک کی سیدھ میں کس طرح چل سکتے ہیں۔ یہاں تو قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی ہیں۔ کہیں نوکیلی چٹانیں ہیں، تو کہیں خاردار جھاڑیاں۔"

"آپ آیئے تو۔ اس بہانے ہم ناک کی سیدھ میں سفر کرنا ہی سیکھ جائیں گے۔"

یہ پارٹی بھی وادی کے آخری سرے تک پہنچ گئی، لیکن کوئی کنواں انہیں نظر نہ آیا۔ تیسری طرف خان رحمان کہہ رہے تھے۔

"یار جمشید، یہ چکر میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ہم تو نکلے تھے صدر جوناف کے

ملک کو بچانے اور وہاں پہنچنے سے پہلے ہی پھنس گئے۔ آخر یہ سب کیا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ ایک عدد سازشی ذہن کا کام ہے، جہاز کے عملے کمانڈر نے بھی یہی بتایا تھا۔"

"سازشی ذہن، کیا مطلب؟"

اس پوری سازش کی باگ ڈور کسی بہت ہی خطرناک آدمی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ ہمیں انگلیوں پر نچا رہا ہے۔

"ہوں، لیکن اب ہم اس کنویں کو کہاں تلاش کریں، اس وادی سے کیسے نکلیں۔"

یہ لوگ بھی وادی کے آخر تک ہو آئے، پھر الو کی آواز کے ذریعے ایک جگہ جمع ہوئے۔ سب کے چہروں پر ناکامی صاف لکھی تھی۔

"اس کا مطلب ہے، کنواں کسی کو بھی نہیں ملا، خیر کنویں پر ڈالو خاک۔ اس وادی سے باہر نکلنے کے امکانات پر غور کرو۔"

"لیکن ابا جان، خاک کس طرح ڈالیں، جب کنواں ملا ہی نہیں۔" فاروق بولا۔

"کنویں کے بدلے میں کیوں نہ تمہارے سر پر خاک ڈال دی جائے۔" فرزانہ جل کر بولی۔

"لیکن مشکل تو یہ ہے کہ تم اس پتھریلی زمین پر خاک لاؤ گی کہاں سے؟"

لاحول ولا قوۃ، تم تینوں خاک کے پیچھے پڑ گئے۔ اگر ہم وادی سے نہ نکل سکے تو یہ سوچ لو کہ یہاں بھوکوں مر جائیں گے، کیونکہ میں نے ابھی تک یہاں کسی پرندے کو بھی اڑتے نہیں دیکھا، جسے ہم شکار ہی کر لیں گے۔"

"اوہ۔" ان سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا، کیوں کہ ابھی تک تو وہ اس

خوش فہمی میں تھے کہ پرندے شکار کر کے پیٹ کی آگ بجھائیں گے۔"

"اب کیا ہوگا؟" پروفیسر داؤد بولے۔ کیونکہ انہیں بھوک برداشت نہیں ہوتی تھی۔

اب انہوں نے وادی سے نکلنے کے امکانات کا جائزہ لینا شروع کیا، پہاڑ بالکل عمودی تھے۔ ان میں جگہ جگہ درخت ضرور ابھرے ہوئے تھے، لیکن آپس میں ان درختوں کا فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ وہ ان کی مدد سے بھی اوپر نہیں پہنچ سکتے تھے۔ وادی میں بے شمار درختوں پر بجلی کے تاروں جتنی باریک بیلیں سی پھیلی نظر آئیں۔ خان رحمان کی نظریں ان بیلوں پر جم گئیں۔ آخر انہوں نے کہا:

"یہ وقت دوپہر کا ہے۔ ہو سکتا ہے، یہاں کچھ پرندے موجود ہوں۔ لیکن دھوپ کی وجہ سے اپنے گھونسلوں میں گھسے ہوئے ہوں۔ کم از کم ہمیں اتنا تو کر ہی لینا چاہیے کہ انہیں شکار کر سکیں۔"

"لیکن انکل، ہم انہیں کس طرح شکار کر سکیں گے۔" فاروق نے کہا۔

"ہم ان بیلوں اور درختوں کی شاخوں کی کمانیں بنا سکتے ہیں۔ اور شاخوں کے تیر بھی بن جائیں گے۔ کچھ پتھر بھی ہم کام میں لا سکتے ہیں۔ محمود، اپنا چاقو نکالو۔" اور تم لوگ درختوں کی شاخیں توڑنا شروع کر دو۔ کوشش کرنا کہ مضبوط شاخیں توڑی جائیں۔"

وہ اس کام میں جٹ گئے۔ پروفیسر داؤد تک بیٹھے نہیں رہے، حالانکہ انسپکٹر جمشید نے ان سے کہا بھی کہ وہ آرام کریں۔ لیکن انہوں نے گوارا نہیں کیا اور بولے:

"ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی دوسروں کو ساتھ برابر کام کرتے تھے، یہاں تک کہ آپ نے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ مل کر خندق بھی کھودی۔"

ان کی اس بات نے انسپکٹر جمشید کو خاموش کر دیا، خود وہ چاقو کی مدد سے شاخوں کو گھڑنے میں مصروف تھے۔ یہ کام بجلی کی سی تیزی سے شروع ہوا اور شام سے پہلے پہلے بے شمار تیر اور چھ کمانیں تیار کی جا چکی تھیں۔ رسی کا کام درختوں کی بیلوں سے لیا گیا اور پھر انہوں نے پرندوں کی آوازیں سنیں۔ ان کے دل خوشی سے جھومنے لگے۔ تیروں کی مدد سے پرندوں کو شکار کرنے کا ان کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ دو گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد انسپکٹر جمشید اور خان رحمان کے چند تیر نشانے پر بیٹھ ہی گئے۔

اب مرحلہ تھا آگ جلانے کا۔ خشک جھاڑیوں اور شاخوں کا ایک ڈھیر جمع کیا گیا۔ اور لائٹر کے ذریعے اس ڈھیر کو آگ دکھا دی گئی۔ پرندوں کا بھنا ہوا گوشت کھا کر وہ ابھی فارغ ہی ہوئے تھے کہ ایک ہیلی کاپٹر کی آواز نے ان سب کو چونکا دیا۔

☆☆☆

کالا شکاری

ان کی آنکھ کھلی تو وہ ایک چٹیل میدان میں تھے۔ دور دور تک کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔

''ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے ہم کوئی خواب دیکھ رہے ہیں یا پھر ہم کسی جادوئی چکر میں پھنس گئے ہیں۔ جادو کی کہانیوں میں تو بچپن میں ایسا پڑھا کرتے تھے کہ جن نے کہا، آنکھیں بند کر لو۔ آنکھیں کھولنے پر انہوں نے خود کو ایک چٹیل میدان میں پایا۔ آنکھ کھلی تو وہ کوہ قاف میں تھے۔ اور پریاں انہیں گھیرے میں لیے کھڑی تھیں۔'' آصف نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

''جہاں تک مجھے یاد ہے، ہم انوار شام کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے، اس نے ایک پارسل لا کر دیا تھا اور اسے کھول کر دیکھنے کی درخواست کی تھی۔ کھولنے کی کوشش کرتے ہی ایک دھماکا ہوا تھا اور ہم بے ہوش ہو گئے تھے۔ میرا خیال ہے، یہ ابھی تھوڑی دیر پہلے کی بات ہے۔'' فرحت بولی۔

''ہاں، کیونکہ یہ دوپہر کا وقت ہے اور ہم دوپہر سے کچھ دیر پہلے انوار شام کی کوٹھی میں موجود تھے۔''

''ارے، مگر میری گھڑی۔'' آفتاب کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا۔

''کیا ہوا تمہاری گھڑی کو، کلائی پر بندھی تو ہے۔'' فرحت نے منہ بنایا۔

''ہاں، شاید خراب ہوگئی ہے۔'' آفتاب نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

''کیوں، کیا چل نہیں رہی۔'' آصف نے پوچھا۔

''چل تو رہی ہے، لیکن پھر بھی میرا خیال ہے کہ یہ غلط ہے۔''

''کیا بات کرتے ہو ٹھہرو ہم ٹائم ملا لیتے ہیں۔'' اس نے ریت پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ ہی آصف اور فرحت بھی سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ ابھی تک وہ لیٹے لیٹے ہی باتیں کرتے رہے تھے۔ آصف نے وقت دیکھتے ہوئے کہا۔

''میری گھڑی میں سوا بارہ بجے ہیں۔''

''میری گھڑی میں بارہ بج کر چودہ منٹ ہوئے ہیں۔'' فرحت بولی۔

''اور میری گھڑی میں بارہ بج کر سوا پندرہ منٹ۔'' آفتاب بولا۔

''پھر تم یہ کس طرح کہہ سکتے ہو کہ تمہاری گھڑی غلط ہے۔'' فرحت نے تنک کر کہا۔

''اچھا تم ذرا مجھے اپنی اپنی گھڑی دکھاؤ۔'' آفتاب نے مسکرا کر کہا۔ انہوں نے اپنی گھڑیاں آگے کر دیں۔ ان پر نظر ڈالتے ہی آفتاب چونک اٹھا اور بولا:

''ہائیں، یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں، تم دونوں کی گھڑیاں بھی خراب ہو چکی ہیں۔''

''شاید تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ آخر تم ان گھڑیوں کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔'' فرحت نے چلا کر کہا۔

''جب ہم گھر سے چلے تھے تو کیا تاریخ تھی؟''

''اکیس تاریخ تھی۔'' آصف نے کہا، ساتھ ہی اس کی نظر گھڑی پر پڑی۔ یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں کہ اس پر پچیس تاریخ تھی۔ اس نے

جلدی سے فرحت کی گھڑی دیکھی، وہ بھی یہی تاریخ بتا رہی تھی۔

''ت، تو کیا تمہاری گھڑی میں بھی پچیس تاریخ ہے۔''

''ہاں، اسی لیے تو میں یہ کہہ رہا ہوں کہ تینوں گھڑیاں خراب ہوگئی ہیں۔'' آفتاب نے چیختی آواز میں کہا۔

''ت، ت تو ہم چار دن تک بے ہوش رہے ہیں۔''

''اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔'' فرحت بولی۔ اب ان کے رنگ اڑ گئے۔

''یا اللہ رحم، ہمارے گھر والوں کا کیا حال ہوگا۔ انکل تو تلاش کرتے کرتے پاگل ہو گئے ہوں گے۔''

''لیکن بھئی، عجیب بات ہے۔'' آفتاب نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کی مسکراہٹ انہیں غصہ دلا رہی تھی۔

''یہ تم پر مسکرانے کا دورہ تو نہیں پڑ گیا۔'' فرحت نے بوکھلا کر کہا۔

''عجیب بات یہ ہے کہ مجھے بھوک بالکل نہیں لگ رہی۔ اگر ہم چار دن تک بے ہوش رہے ہیں تو بے تحاشا بھوک محسوس ہونا چاہیے تھی۔''

''بھئی، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ انوار شام ہمیں بے ہوشی کی حالت میں کچھ پلاتا رہا ہو۔''

''ہوں، اس کا امکان بھی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ وہ چاہتا کیا ہے؟''

''ت۔ خدا جانے۔ ارے باپ رے۔'' آفتاب نے بوکھلا کر کہا۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ پھر اس کے منہ سے تھرتھراتی آواز میں نکلا:

''بھبھوت۔''

''یہ بھبھوت کیا ہوتا ہے؟'' آصف نے منہ بنایا۔

"شاید بھوت کا بڑا بھائی ہوگا۔" فرحت نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا، لیکن اس پر بھی آفتاب نے ان کی طرف نہ دیکھا۔ وہ تو بدستور ایک ریت کے ٹیلے کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ جب سے وہ ہوش میں آئے تھے، ان کی نظر ٹیلے پر تو پڑی تھی، لیکن ٹیلے پر بیٹھے ہوئے آدمی کو وہ پہلی مرتبہ دیکھ رہے تھے۔ اس پر نظر پڑتے ہی آصف اور فرحت کی بھی سٹی گم ہوگئی۔ وہ تو واقعی کوئی بھوت نظر آ رہا تھا۔ اس کا پورا جسم بالکل سیاہ تھا، توے کی مانند۔ اس پر انگارا سی آنکھیں اور خون جیسے سرخ ہونٹ اگر وہ تاریکی میں اسے دیکھ لیتے تو شاید ڈر کے مارے بے ہوش ہی ہو جاتے، تاہم اس وقت بھی ان کی سٹی گم ہو چکی تھی۔ وہ پتھر کا بت بنے اسے دیکھتے رہے۔ پھر اس بھوت کے جسم میں حرکت ہوئی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوگیا۔ اب انہوں نے دیکھا۔ اس کا قد ایک لمبے آدمی سے زیادہ نہیں تھا۔

"میرا۔ میرا خیال ہے، یہ بھوت نہیں ہے۔"

"لیکن اس چٹیل میدان میں یہ کیا کر رہا ہے؟"

"یہ تو یہی بتا سکتا ہے۔"

کالا آدمی لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ان سے نزدیک ہوتا جا رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی ان کے رونگٹے کھڑے ہوتے جا رہے تھے۔ اس کے ایک ہاتھ میں نیزہ تھا، دوسرے میں ایک کمان تھی اور کندھے سے ایک بڑا سا ترکش لٹک رہا تھا، جس میں بہت سے تیر تھے۔

"کک۔ کالا شکاری۔" آفتاب کے منہ سے نکلا۔

"کالا شکاری، کیا مطلب؟"

"ان حالات میں اسے اور کیا نام دیا جا سکتا ہے۔" آفتاب نے منہ بنایا۔

"شکاری بھوت بھی تو کہہ سکتے ہیں۔" فرحت جلدی سے بولی۔

"خیر ہوگا، ہمیں کیا۔"

اتنے میں کالا آدمی ان کے نزدیک آ گیا۔ اس کے حلق سے ایک بھاری بھرکم آواز نکلی:

"ہیلو بچو، تم میری اس جاگیر میں کیا کر رہے ہو؟"

"جی، پتا نہیں، کیا کر رہے ہیں۔" آفتاب نے گڑبڑا کر کہا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"ہمیں تو یہ بھی پتا نہیں کہ یہ کیا بات ہوئی یا کیا نہیں ہوئی۔" آفتاب بولا۔

"تمہیں کچھ پتا بھی ہے۔" کالے آدمی نے جھلا کر کہا۔

"پتا نہیں۔" آفتاب بولا۔ آصف اور فرحت ہنسے بغیر نہ رہ سکے۔

"اچھا تو آؤ میرے ساتھ۔" اس نے دعوت دینے کے انداز میں کہا۔

"لیکن پہلے یہ تو بتا دیں، کہ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں اور یہ کون سی جگہ ہے۔" آفتاب نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ جب میری آنکھ کھلی تھی تو میں نے خود کو اس چٹیل میدان میں پایا تھا۔ یہاں چاروں طرف سوائے ریت کے بس تم تھے۔ میں نے تمہیں ریت پر سوتے پایا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ چلو میرے علاوہ بھی کچھ انسان یہاں موجود ہیں، پھر میں تمہارے ہوش میں آنے کا انتظار کرتا رہا۔ آخر تمہیں ہوش آ ہی گیا۔"

"تم نے کیا کہا، تمہاری آنکھ کھلی تو تم نے خود کو اس میدان میں پایا تھا۔ تو کیا، تمہیں بھی کسی نے بے ہوش کر کے یہاں ڈال دیا ہے۔"

"ہاں، ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ مجھے اپنی جیب میں چند گولیاں بھی پڑی ملی تھیں۔ میں نے ان میں سے ایک گولی کھالی۔ بس کیا بتاؤں۔ مزا ہی آ گیا، اس قدر

''مزے دار گولیاں میں نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں کھائیں۔''

''مزے دار گولیاں۔'' ان کے منہ میں پانی آ گیا۔ اچانک انہیں اپنی بھوک میں شدید اضافہ محسوس ہونے لگا۔

''اچھے کالے، کیا تم ہمیں ایک ایک گولی نہیں دے سکتے۔'' آفتاب نے سوچے سمجھے بغیر کہا۔

''تم نے کیا کہا، اچھے کالے۔''

''ہاں، تو گندے کالے تو نہیں کہا۔ اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے۔ کیا تم کالے بھجنگ نہیں ہو۔''

''ہوں گا، لیکن تمہارے منہ سے یہ مجھے اچھا نہیں لگا۔ اب تو میں ہرگز گولیاں نہیں دوں گا۔'' اس نے بچوں کی طرح ضد کرنے کے انداز میں کہا۔

''اچھا، اب نہیں کہوں گا۔ میرے دونوں ساتھی بھی نہیں کہیں گے۔ دیکھو، ہمیں بھوک بہت لگی ہے۔ ایک ایک گولی دے دو۔'' آفتاب نے ایسے انداز میں کہا، جیسے کوئی کھانے کی بہت سی چیز مانگ رہا ہو۔

''ان گولیوں کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ بھوک ایک دم غائب ہو جاتی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''ارے کیا واقعی؟'' تینوں ایک ساتھ بولے۔

''ہاں، اچھا لو تم بھی کیا یاد کرو گے۔''

اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور تین گولیاں نکال کر انہیں ایک ایک دے دی۔ انہوں نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ، گولیاں منہ میں ڈال لیں۔ گولیاں واقعی مزے دار تھیں۔ منہ میں حل بھی فوراً ہی ہو گئیں۔ اچانک انہیں یوں محسوس ہوا، جیسے انہیں زندگی میں کبھی بھوک لگی ہی نہیں تھی۔

''حیرت انگیز، بھوک تو بالکل غائب ہو گئی۔ کیا ایسی اور بھی گولیاں ہمارے پاس ہیں؟'' آصف نے پوچھا۔

''ہاں، چار گولیاں اور ہیں۔'' اس نے جواب دیا: ''جب بھوک محسوس ہو گی، ایک ایک پھر کھا لیں گے۔'' اس نے کہا۔

''اچھا، اب ذرا دو دو باتیں ہو جائیں۔ پہلی بات تو یہ کہ آپ کو ریت کے ٹیلے پر بیٹھا دیکھ کر ہم نے یہ خیال کیا تھا کہ آپ کوئی بھوت ہیں۔ امید ہے، ہمارے اس بے ہودہ خیال پر آپ ہمیں معاف فرمائیں گے، کیونکہ آپ تو ہر لحاظ سے آدمی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ آپ اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیں، آپ کون ہیں؟ آپ کو کس نے بے ہوش کیا تھا، کیوں کیا تھا اور آپ یہاں کس طرح پہنچ گئے۔'' آصف جلدی جلدی کہتا چلا گیا۔

''میرا نام کامران مرزا ہے۔ میں اپنے بچوں کی تلاش میں ایک شخص انوار شام تک پہنچا تھا۔ اس کا تعاقب کرتے ہوئے ایک دراڑ میں داخل ہوا اور پھر مجھ پر جال پھینک کر بے بس کر دیا گیا۔ اس کے بعد میری آنکھ کھلی تو خود کو اس میدان میں پایا۔ تم لوگ بھی میرے نزدیک ہی لیٹے تھے۔ میں خود ہی اٹھ کر دور چلا گیا کہ کہیں تم مجھے دیکھ کر ڈر نہ جاؤ۔''

''آپ نے کیا نام بتایا، کامران مرزا! کیوں مذاق کرتے ہو، یہ تو میرے ابا جان کا نام ہے۔ لیکن ان کا رنگ تو دودھ کی طرح سفید ہے۔''

''یہ اس گولی کا اثر ہے یار۔'' اس مرتبہ انہوں نے اپنی اصل آواز میں جھلائے ہوئے لہجے میں بولے۔

''ارے، یہ تو واقعی ابا جان ہیں۔''

''انکل، آپ اور اس حال میں۔''

"ہاں، آنکھ کھلنے کے بعد میں نے اپنی جیبوں کا جائزہ لیا تو ایک جیب میں آٹھ گولیاں موجود تھیں۔ بھوک اور پیاس بہت شدت کی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے بے خیالی میں گولی کو چکھ کر دیکھا۔ وہ مزے دار لگی تو سوچے سمجھے بغیر اسے منہ میں رکھ لیا۔ کھاتے ہی بھوک پیاس غائب ہو گئی۔ میں تم لوگوں کے ہوش میں آنے کا انتظار کرتا رہا۔ آخر خدا خدا کر کے تم تین دن بعد ہوش میں آئے۔"

"جی کیا فرمایا، تین دن بعد؟"

"ہاں، تم اپنی گھڑیاں دیکھ تو چکے ہو۔"

"اور، ہمارا خیال تھا کہ گھڑیاں غلط ہیں۔"

"نہیں، ہم تین دن بعد ہوش میں آئے ہیں۔"

"ارے باپ رے، آپ نے کیا بتایا تھا کہ اس گولی کو کھانے کے بعد آپ کا رنگ کالا ہو گیا تھا۔"

"ہاں، بالکل یہی بات ہے۔" وہ مسکرائے۔

"اور اس کے باوجود آپ نے ہم تینوں کو بھی یہ گولیاں کھلا دیں۔" آفتاب نے بوکھلا کر کہا۔

"ہاں، میں نے سوچا کیوں نہ ہم چاروں ایک ہی رنگ میں رنگ جائیں۔ ہمارے دشمن بھی شاید یہی چاہتے ہیں۔"

"لل، لیکن اب کیا ہوگا۔ ہمارے اصل رنگ واپس کیسے آئیں گے؟"

"پتا نہیں، ابھی تم تینوں کے رنگ تو خیر نہیں بدلے، لیکن بدل جائیں گے۔ فکر نہ کرو، میرا رنگ بھی کافی دیر بعد بدلا تھا۔ یہ بتاؤ کیا میرے چہرے کا رنگ بھی اتنا ہی کالا ہو گیا ہے، جتنا کہ باقی جسم کا۔" انہوں نے پوچھا، کیونکہ وہ اپنا چہرہ نہیں دیکھ سکتے تھے۔

"جی ہاں، سر سے پیر تک آپ ایک ہی رنگ میں رنگے نظر آ رہے ہیں۔" فرحت نے پریشان آواز میں کہا۔

"آؤ، اس میدان کی سیر کریں۔ وقت تو گزارنا ہی ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ لوگ آخر چاہتے کیا ہیں؟ ہمیں اس طرح یہاں کیوں لائے ہیں کیا وہ پارسل صرف اس لیے غائب کیا گیا تھا کہ تم اس کی تلاش میں نکلو اور میں تمہاری تلاش میں، پھر ہم یہاں پہنچا دیے جائیں۔"

"معلوم تو یہی ہوتا ہے۔"

وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور میدان کی ایک سمت میں چلنے لگے۔ رفتہ رفتہ ان کے رنگ کالے پڑنے لگے اور تقریباً ایک گھنٹے بعد ان کے رنگ میں اور انسپکٹر کامران مرزا کے رنگ میں کوئی فرق نہیں رہ گیا تھا۔

"لیجیے ابا جان، آپ کی خواہش پوری ہو گئی۔ ہم بھی آپ کے رنگ میں رنگ گئے ہیں۔"

اچانک فرحت کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے چونک کر ان تینوں کی طرف دیکھا۔

"آپ کو کچھ سنائی دیا؟"

"ہاں، ایک ہیلی کاپٹر کی آواز آ رہی ہے۔ بہت ہی مدھم سی آواز۔"

انسپکٹر کامران مرزا نے آسمان میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ وہ بھی دیکھنے لگے، لیکن ہیلی کاپٹر انہیں کہیں نظر نہ آیا۔

اچانک ہیلی کاپٹر کی آواز تیز ہو گئی۔ انہیں سمت کا بھی اندازہ ہو گیا۔ وہ تیزی سے اسی سمت میں مڑے۔ دور بہت دور ایک ہیلی کاپٹر اتر رہا تھا۔ اس کا رخ مخالف سمت میں تھا۔

بھاگو اس طرف، شاید ہمیں مدد مل جائے۔" انسپکٹر کامران مرزا چلائے۔

اور پھر انہوں نے بے تحاشا دوڑنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی ہاتھ اوپر اٹھا کر زور زور سے ہلا بھی رہے تھے۔ چیخ چلا بھی رہے تھے، لیکن ہیلی کاپٹر تو ابھی بہت دور تھا اور جا بھی ان سے آگے آگے رہا تھا۔ اس کے نزدیک ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، دوسرے یہ کہ وہ بہت اونچائی پر تھا: تاہم وہ ضرورت مند تھے اور ضرورت مند دیوانہ ہوتا ہے۔ ہیلی کاپٹر کو دیکھ کر وہ بھی دیوانے سے ہو گئے تھے۔ بس بے تحاشا بھاگے چلے جا رہے تھے اور پھر انہوں نے ہیلی کاپٹر کو نیچے اترتے دیکھا۔ یہ دیکھ کر ان پر اور بھی جوش کی کیفیت طاری ہو گئی۔

"اگر یہ کہیں اتر گیا تو ہم ضرور اس تک پہنچ جائیں گے۔" آصف نے چلا کر کہا۔

"ہاں، لیکن اپنے حواس قابو میں رکھو۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

وہ بدستور بھاگتے رہے۔ ہیلی کاپٹر نیچے اترتے اترتے اب ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

"وہ کہیں اتر چکا ہے، ہمیں مدد مل سکتی ہے۔" فرحت نے پُر امید لہجے میں کہا۔ جواب میں انسپکٹر کامران مرزا خاموش رہے تو اس نے بے تابی کے عالم میں کہا۔

"کیا آپ کو میری بات سے اتفاق نہیں ہے انکل۔"

"مجھے یہ اتنا آسان نظر نہیں آتا۔ جو لوگ ہمیں یہاں ڈال گئے ہیں، وہ ہماری طرف سے بے خبر نہیں ہو سکتے۔ دوسرے یہ کہ ان کا ہمیں یہاں لا کر ڈال دینے کا ضرور کوئی مقصد ہے، لہٰذا یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ہماری مدد کے لیے یہاں کوئی ہیلی کاپٹر پہنچ جائے۔" انہوں نے کہا۔

"تب پھر آپ کیوں ہیلی کاپٹر کی طرف دوڑ رہے ہیں اور ہمیں بھی دوڑا رہے ہیں۔" آفتاب نے بدستور دوڑتے ہوئے کہا۔

"شاید اس لیے کہ یہی مرضی میرے صیاد کی ہے۔" انسپکٹر کامران مرزا گنگنانے کے انداز میں بولے۔

"اگر یہ لوگ ہمیں دوڑا دوڑا کر مارنا چاہتے ہیں، تو ہم کیوں دوڑیں۔"

"اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے۔ ہم ان کے اشاروں پر ناچنے پر مجبور ہیں۔" وہ بولے۔

تقریباً دو گھنٹے تک دوڑتے رہنے کے بعد انہیں ایک پہاڑ نظر آنے لگا، لیکن ابھی یہ پہاڑ بھی کئی گھنٹے کے فاصلے پر تھا اور اس کے آس پاس وہ ہیلی کاپٹر نظر بھی نہیں آ رہا تھا۔ اچانک انہوں نے ایک بار پھر ہیلی کاپٹر کی آواز سنی۔ ان کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آواز کی طرف دیکھنے لگے۔ آواز پہاڑ کے دوسری طرف سے آ رہی تھی۔ پھر ہیلی کاپٹر بلند ہوتا نظر آیا۔ وہ پہاڑ کے دوسری طرف سے اٹھا تھا۔ وہ ٹھٹک کر رک گئے۔ ہیلی کاپٹر ہر لمحے اونچا ہوتا جا رہا تھا اور ان کی مایوسی میں متواتر اضافہ ہوتا جا رہا تھا: حالانکہ انسپکٹر کامران مرزا نے انہیں بتا دیا تھا کہ مدد کا ملنا اتنا آسان نہیں ہوگا۔ اور وہی ہوا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے نظروں سے اوجھل ہوتے دیکھتے رہے۔

"اب۔ اب کیا ہوگا انکل؟"

"خدا کو جو منظور ہوگا، وہی ہوگا۔ آؤ اس پہاڑ تک چلیں۔"

"لیکن انکل، یہ تو بہت فاصلے پر ہے۔"

"ہاں، لیکن میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ پہاڑ کے دوسری طرف کیا ہے۔ ہیلی کاپٹر اس طرف کیوں اترا تھا۔ یہ تو ہمیں دیکھنا ہی ہوگا۔"

"ہوں، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" اور وہ ایک بار پھر پہاڑ کی طرف دوڑنے لگے۔ مزید دو گھنٹے دوڑنے اور چلنے کے بعد آخر وہ پہاڑ تک پہنچ گئے۔ یہ دیکھ کر انہیں حیرت ہوئی کہ پہاڑ زیادہ اونچا نہیں تھا اور اس پر چڑھنا نہایت آسان تھا۔ خاص طور پر ان جیسے لوگوں کے لئے تو اور بھی آسان تھا۔

"اوہو، یہ کام تو بہت آسان ہے۔"

"ہاں، اب ہم دوسری طرف دیکھ سکیں گے۔" انسپکٹر کامران مرزا کے لہجے میں جوش تھا۔

"اور شاید اس طرف بھی پہنچ سکیں گے۔" آصف بولا۔

"خیر، ابھی یہ تو نہیں کہا جا سکتا۔"

اگرچہ وہ دوڑ دوڑ کر تھک چکے تھے، لیکن پھر بھی تجسس انہیں پہاڑ پر چڑھائے گیا۔ یہاں تک کہ وہ چوٹی پر پہنچ گئے۔ ایک دوسرے کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے انہوں نے دوسری طرف جھانکا اور انہیں اپنے پیروں تلے سے زمین نکلتی محسوس ہوئی۔

☆☆☆

اصل خطرناک بات

انہوں نے دیکھا، ہیلی کاپٹر وادی کے کافی اوپر تھا، لیکن دھیرے دھیرے نیچے اتر رہا تھا۔

"اب یہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

"شاید ہماری بے بسی کا تماشا دیکھنے آئے ہیں۔" فرزانہ نے تلملا کر کہا۔

"ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے، ہیلی کاپٹر کے بغیر اس وادی سے نکلنا تقریباً ناممکن ہی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ہمیں یہاں سے نکالنے کے لئے آئے ہوں۔"

"اگر نکالنا ہوتا تو یہاں چھوڑ کر ہی کیوں جاتے۔" محمود نے برا سا منہ بنایا۔

وہ سر اوپر اٹھائے اسے نیچے اترتا دیکھتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ ان کے سروں سے کوئی سو میٹر اونچائی پر رک گیا۔

"ہیلو دوستو۔" ایک چہکتی آواز وادی میں گونجی۔ پہاڑوں نے اسے دہرایا۔

"ہم نے ایک فیصلہ کیا ہے، اگر تم اس وادی میں تین دن تک زندہ رہ سکے تو تیسرے دن ہم خود تمہیں یہاں سے نکالنے کے لیے پہنچ جائیں گے۔ شرط یہی ہے کہ تین دن تک تم زندہ رہ کر دکھا دو۔ اور ہاں، یہ ہم ایک رسی کا گچھا پھینک رہے ہیں، اس کے ذریعے اگر تم وادی سے باہر نکل سکو تو اور بھی اچھی بات ہے۔" اس کے ساتھ ہی ایک گچھا گرتا نظر آیا۔

"آخر تم لوگ چاہتے کیا ہو؟" انسپکٹر جمشید چلائے۔

"یہ تو ہمیں خود بھی نہیں معلوم کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔" ہیلی کاپٹر میں سے آواز ابھری۔

"کیا مطلب؟"

"یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے، صرف ایک شخص کے اشاروں پر ہو رہا ہے۔ ہم ان کے اشارے پر ناچنے والی کٹھ پتلیاں ہیں۔ وہ ہمیں جیسے چاہتے ہیں، نچاتے ہیں۔ ہم بے بس ہیں۔ نہ اپنی مرضی سے کچھ کر سکتے ہیں، نہ کہہ سکتے ہیں۔ مرضی صرف ان کی چلتی ہے۔ بڑے بڑے ان کے اشاروں پر بجلی کی طرح حرکت میں آ جاتے ہیں، ہم تو کیا چیز ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم، ان کا منصوبہ کیا ہے، وہ کیا چاہتے ہیں۔ ان کے پروگراموں کے بارے میں کوئی شخص پہلے سے کوئی اندازہ قائم نہیں کر سکتا۔ ان کے منصوبے کو کوئی شخص پہلے سے نہیں سمجھ سکتا۔ وہ ایسے ایسے چکر دیتے ہیں کہ آدمی خود کو گھن چکر محسوس کرنے لگتا ہے۔" وہ کہتے کہتے شاید سانس لینے کے لیے رکا۔ اس موقعے سے فاروق فائدہ اٹھاتے ہوئے بول اٹھا:

"وہ تو خیر ہم خود کو بہت دیر سے محسوس کر رہے ہیں۔"

"بس یہی بات ہے۔ ابھی تم تین دن تو خود کو نہ جانے کیا کیا سمجھنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔ اب اس وادی کو ہی لے لو۔ یہ ان ہی کی دریافت ہے۔"

"اچھا کم از کم اتنا تو بتا دو کہ یہ وادی ہمارے ہی ملک میں ہے۔"

"نہیں، یہ تمہارے ملک سے بہت دور ہے۔" جواب دیا گیا۔

"اس شخص کا نام کیا ہے، جس کے اشاروں پر یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ابھی یہ بتانے کی اجازت نہیں۔ ہم وہی باتیں بتا سکتے ہیں، جن کی انہوں نے اجازت دے رکھی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ہمیں تین دن تک خود کو اس وادی میں زندہ رہنا ہو گا۔ تیسرے دن تم لوگ آ کر ہمیں یہاں سے نکال لو گے۔ اس دوران ہم اس رسی کے ذریعے خود بھی کوشش جاری رکھ سکتے ہیں۔"

"ہاں، بالکل یہی بات ہے۔"

"ٹھیک ہے، دیکھا جائے گا۔" انسپکٹر جمشید نے لاپروائی سے کہا۔

ہیلی کاپٹر اوپر اٹھنے لگا۔ وہ اسے اوپر اٹھتے اس وقت تک دیکھتے رہے، جب تک کہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔ آخر رسی کا گچھا اٹھاتے ہوئے انہوں نے کہا:

"امید تو ہے، ہم اس رسی سے کام لے سکیں گے۔"

"لیکن کیسے، مجھے تو اس کی کوئی امید نظر نہیں آ رہی۔" خان رحمان نے کہا۔

"بھئی جمشید، میرا بھی یہی خیال ہے۔ اس ہیلی کاپٹر والے نے جو کہا تھا۔ وہ درست ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس شخص کی انگلیوں پر ناچنے کے سوا ہم کچھ نہیں کر سکتے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"کوشش کرنا فرض ہے۔" یہ کہہ کر وہ گچھے کو کھولنے لگے، یہاں تک کہ

ساری رسّی کھل گئی۔ اب انہوں نے رسّی کا ایک سرا ایک تیر میں باندھا، تیر کو کمان میں چڑھایا اور پوری طاقت سے اسے پہاڑی چوٹی کی طرف پھینکا۔ پتھریلی زمین پر پڑی رسّی نہایت تیزی سے اوپر گئی، لیکن پھر تیر پہاڑی چوٹی سے بھی کم بلندی تک جا کر واپس گرنے لگا۔

"اوہ یہ کیا ہوا؟" محمود کے منہ سے نکلا۔

"رسّی کا وزن بڑھ گیا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا جمشید۔" پروفیسر داؤد کے لہجے میں مایوسی کی جھلک تھی۔

"اگر ہم رسّی کے ایک سرے پر پتھر باندھ کر پھینکیں تو کیسا رہے۔" فرزانہ نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اتنی اونچائی تک پتھر پھر بھی نہیں جائے گا۔" محمود نے کہا۔

"لیکن اس کا وزن تیر سے تو زیادہ ہوگا۔" فرزانہ نے اعتراض کیا

"میرا خیال ہے، ایسا کر کے دیکھ لینے میں بھی کوئی حرج نہیں۔" انسپکٹر جمشید نے کہا، پھر محمود اور فاروق سے بولے:

"کوئی ایسا پتھر تلاش کر کے لاؤ، جس پر رسّی اچھی طرح باندھی جا سکے۔"

"جی بہتر۔ آؤ بھئی پتھر ڈھونڈنے چلیں۔ یہ کام بھی کرنا تھا۔" فاروق نے بے بسی کے انداز میں کہا۔

"آؤ فرزانہ چلیں۔"

"ابا جان نے مجھ سے نہیں کہا، تم دونوں جاؤ، ایسے کام تم ہی کر سکتے ہو۔" فرزانہ شریر انداز میں مسکرائی۔

"خیر، سمجھیں گے تم سے بھی۔" فاروق پیر پٹخ کر بولا اور دونوں پتھر کی

تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ آخر وہ ایک ایسا پتھر تلاش کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے جو کناروں پر سے موٹا اور درمیان میں سے پتلا تھا، درمیانی حصے میں رسّی باندھے کی صورت میں وہ نکل نہیں سکتی تھی۔ پتھر کو دیکھ کر انسپکٹر جمشید نے پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

"بہت خوب، بالکل ویسا ہی پتھر تلاش کر کے لائے ہو، جیسا میں چاہتا تھا۔"

"ثابت ہوا کہ یہ اس کام کے بہت ماہر ہیں۔" فرزانہ بول پڑی۔ دونوں نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

خان رحمان اور انسپکٹر جمشید مل کر پتھر کے گرد رسی کو مضبوطی سے باندھنے لگے اور جب انہوں نے مضبوطی کا اندازہ کر لیا تو انسپکٹر جمشید نے ان سب کو دور ہٹا دیا، کیونکہ پتھر کسی کے لگ جاتا تو اس کا زندہ بچنا بہت مشکل تھا۔ اب انہوں نے رسّی کو پکڑ کر گھمانا شروع کیا۔ پتھر گھومنے لگا۔ گھومنے کی رفتار لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی چلی گئی اور جب بلا کی تیزی آ گئی تو انہوں نے ایک جھٹکے سے رسّی چھوڑ دی۔ رسّی ان کے ہاتھ سے تیر کی طرح نکلی اور پتھر پوری رفتار سے اوپر گیا۔ انہوں نے دیکھا، پتھر پہاڑی چوٹی پر گرا تھا۔ چند سیکنڈ کے لئے ان پر جوش طاری ہو گیا۔

"اف خدا جمشید، یہ بھی کوئی کم کامیابی نہیں ہے۔ اب اگر پہاڑی کی چوٹی پر کوئی شخص موجود ہو اور اس رسّی کو کسی درخت سے باندھ دے یا یہ رسی خود بخود کسی درخت کے گرد لپٹ جائے تو ہم اس وادی سے نکل سکتے ہیں۔" خان رحمان نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

"میں اسے آہستہ آہستہ کھینچ کر دیکھوں گا۔ اگر پتھر کسی چیز میں نہ اٹکا، تو پھر کوشش کروں گا، لیکن اس جگہ سے ہٹ کر، شاید یہ کسی درخت کے گرد لپٹ ہی

جائے۔ ایسا ہونا ممکن تو نہیں۔" انہوں نے کہا اور رسی کھینچنے لگے۔ ان کی آنکھیں پہاڑی کی چوٹی پر جمی تھیں۔ رسی کھینچتی چلی آ رہی تھی اور پھر پتھر اوپر سے گرتا نظر آیا۔ مایوسی ان پر ایک بار پھر حملہ آور ہوئی۔ سورج غروب ہونے تک وہ یہ کوشش کرتے رہے، لیکن کوئی کوشش کارگر نہ ہوئی۔ آخر تھک کر بیٹھ گئے۔ بچا ہوا گوشت کھایا اور سونے کی ٹھہری۔ آج انہیں پتھریلی زمین پر کھلے آسمان کے نیچے عمودی پہاڑوں کے درمیان سونا تھا۔ ایسے میں بارش بھی آ سکتی تھی۔ کوئی زہریلا کیڑا بھی ان کے مزاج پوچھنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ اولوں کی بارش بھی ہو سکتی تھی اور ان کے لیے سائے کی کوئی جگہ بھی نہیں تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ نماز سے فارغ ہو کر لیٹ رہے۔

دوسرا دن بھی اسی جدوجہد میں گزرا۔ تیسرے دن بھی کوئی کامیابی کی صورت دکھائی نہ دی۔ دوپہر تک وہ پتھر باری باری اچھالتے رہے۔ لیکن انسپکٹر جمشید سے زیادہ بلندی پر کوئی نہ اچھال سکا۔ ان کے بعد خان رحمان کا نمبر تھا۔ محمود، فاروق، فرزانہ اور پروفیسر داؤد کے اچھالے ہوئے پتھر بس پہاڑ کے درمیان تک جا کر واپس آ رہے۔ ٹھیک دوپہر کے وقت انہوں نے بیلی کاپٹر کی آواز پھر سنی۔ وہ چونک کر اوپر دیکھنے لگے۔ وعدے کے مطابق بیلی کاپٹر آ پہنچا تھا اور وہ زندہ بھی بچ گئے تھے۔ اس دوران وہ پرندے شکار کرتے رہے تھے۔ پانی کا مسئلہ اس طرح حل ہوا تھا کہ پہلے ہی روز انہیں ایک باریک سا چشمہ نظر آ گیا تھا، ورنہ اس وقت وہ بالکل بے دم ہو چکے ہوتے۔ تین دن کی بھاگ دوڑ اور مشقت نے ان کا جو حال کر دیا تھا، وہی اس سے واقف تھے۔

"لو بھئی، بیلی کاپٹر آ پہنچا، ہماری مشکل آسان ہوئی۔ اب کم از کم اس وادی سے تو نکل ہی سکیں گے۔" انسپکٹر جمشید نے پرسکون انداز میں کہا۔ اور فوراً اس

رسی کی طرف لپکے جس کے سرے پر پتھر بندھا تھا۔ انہوں نے اسے جلدی جلدی قمیض کے نیچے کمر کے گرد لپیٹنا شروع کر دیا۔

"لیکن جمشید دشمنوں کے وعدہ کا کیا بھروسا۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"یہ وعدہ انہوں نے کسی مجبوری کی بنا پر نہیں کیا تھا، بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس میں بھی کوئی ان کی چال ہے، کیونکہ انہیں کیا پڑی تھی کہ ہمیں یہاں سے نکالتے اور پھر مشکل تو یہ ہے کہ ہم ان کی چال کے مطابق عمل کرنے پر مجبور ہیں۔ جو وہ چاہتے ہیں، ہمیں وہی کرنا ہوگا، جب تک کہ ہمیں یہ پتا نہیں چل جاتا، ہم کہاں ہیں۔ اپنے ملک سے کتنی دور اور کس سمت میں ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ یہ لوگ چاہتے کیا ہیں۔"

"یہ تو خیر ہمیں معلوم ہے۔ یہ لوگ صدر جوناف کو اغوا کرنا چاہتے تھے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"جی نہیں، صدر جوناف کی آڑ میں دراصل ان لوگوں کا پروگرام ہمیں اغوا کرنے کا تھا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو صدر جوناف کو تو وہ اس وقت بھی اغوا کر سکتے تھے، جب ان کے ملک سے پرواز کی تھی۔ اغوا کرنے والوں کو کیا ضرورت تھی کہ وہ پہلے ہمارے ملک میں آتے۔ ہمیں بھی ساتھ ملاتے اور پھر اغوا کے پروگرام پر عمل کرتے، لہٰذا یہ بات ثابت ہے کہ یہ سب کچھ صرف اور صرف ہمیں اغوا کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ ہاں ہو سکتا ہے کہ انہوں نے سوچا ہو، صدر جوناف بھی مفت ہاتھ آ رہے ہیں تو بُرا کیا ہے۔"

"اوہ۔" خان رحمان کے منہ سے خوف زدہ انداز میں نکلا۔

"یہ۔ یہ تو تم بہت خطرناک بات بتا رہے ہو جمشید۔"

"ابھی تو اصل خطرناک بات میں نے تمہیں بتائی نہیں۔ اگر بتا دوں تو

آپ لوگوں کے چہرے فق ہو جائیں گے۔"

"اور وہی بات ہوگی، جس کی وجہ سے آپ کا چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا۔" فرزانہ نے فوراً کہا۔

"ہاں، تمہارا خیال ٹھیک ہے۔" وہ دھیمے انداز میں مسکرائے۔

"تو پھر اب بتا ہی دو، کیونکہ ہم بے چینی محسوس کر رہے ہیں۔" خان رحمان نے جلدی سے کہا۔

"نہیں، ابھی نہ ہی پوچھو۔ یہی بہتر ہے۔"

ان کے ان الفاظ کے ساتھ ہی ہیلی کاپٹر ان کے سروں کے اوپر آ کر رک گیا۔ اس کا خوف ناک پنکھا چکر کھا رہا تھا۔ اس کا سایہ ان پر پڑنے لگا، پھر جہاز سے وہی آواز ابھری۔

"ہیلو دوستو، تو تم زندہ ہو۔ تین دن کی بھوک پیاس تمہیں مار نہیں سکی، البتہ اس رسی سے بھی تو تم کوئی کام نہیں لے سکے، خیر وعدے کے مطابق ہم یہاں سے نکالنے کے لئے آ گئے ہیں۔ سیڑھی لٹکا رہے ہیں، اوپر آ جاؤ۔"

"لیکن صدر جوناف کا کیا بنے گا۔" محمود نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"ان کا۔ ان کا بھلا اب کیا بچا ہوگا۔ تم لوگ اندھا کنواں تلاش نہیں کر سکے۔ اگر فوری طور پر بھی تلاش کر لیتے، پھر بھی انہیں صحیح سلامت نہیں نکال سکتے تھے۔ اس اندھے کنویں میں کئی سیاہ ناگ بھی رہتے ہیں اور دوسرے زہریلے جانور بھی سیر کرتے ہیں۔ اس کے منہ پر ایک بڑا سا پتھر رکھا ہوا ہے۔ اس پتھر کی وجہ سے ہی تم لوگ کنویں کو تلاش نہیں کر سکے۔ مطلب یہ کہ اب تو وہاں صدر جوناف کی ہڈیاں بھی نیلے رنگ کے پانی میں تبدیل ہو چکی ہوں گی۔ ان کا خیال چھوڑو اور شکریہ ادا کرو اس عظیم انسان کا، جس نے صدر کے ساتھ تمہیں بھی اس کنویں میں پھینکنے کا حکم نہیں دیا تھا،

ورنہ اس وقت تم ہم سے باتیں نہ کر رہے ہوتے۔ سیڑھی لٹکائی جا رہی ہے، اوپر چڑھ آؤ۔ اور اطمینان سے پچھلے حصے میں ٹھنس ٹھنسا کے بیٹھ جاؤ۔ یہ ہیلی کاپٹر ذرا جدید قسم کا ہے۔ تم لوگوں میں سے کوئی اسے اڑا نہیں سکے گا۔ لہٰذا گڑبڑ کرنے کی کوشش بے سود ہوگی۔ یوں بھی تم اپنے ملک سے بہت دور ہو۔ کیا سمجھے؟" وہ خاموش ہو گیا۔

انہوں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ صدر جوناف کے بارے میں سن کر انہیں زبردست دھکا لگا تھا۔ اسی وقت سیڑھی نیچے گری اور ان کی آنکھوں کے سامنے جھولنے لگی۔ ایسے میں محمود، فاروق اور فرزانہ نے ایک دوسرے سے اشاروں میں کہا:

"اب کچھ کر ہی گزرنا چاہیے۔"

سب سے پہلے محمود سیڑھی پر چڑھنے لگا۔ اس کے پیچھے فاروق اور فرزانہ چڑھنے لگے۔

ہیلی کاپٹر کے اگلے حصے میں دو آدمی بیٹھے تھے۔ اگلا حصہ بند تھا۔ پچھلے حصے کا دروازہ کھلا تھا۔ محمود نے اوپر پہنچ کر کچھ کرنے کے بارے میں امکانات کا جائزہ لیا اور پھر اس پر اوس پڑ گئی۔ وہ کسی طرح بھی کچھ کر گزرنے کے قابل نہیں تھے۔ اور پھر انسپکٹر جمشید تو یوں بھی ابھی کچھ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ لہٰذا وہ اندر داخل ہو کر سست انداز میں بیٹھ گیا۔ اسی وقت فاروق پہنچ گیا۔ جب سب لوگ اندر داخل ہو گئے تو دروازہ خود بخود بند ہو گیا اور ایک نیلی روشنی اندر پھیل گئی، اگرچہ دن کا وقت تھا اور وہ بھی دوپہر کا۔ کسی قسم کی روشنی کی ضرورت تو تھی ہی نہیں۔ یہ نیلی روشنی ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ جب محمود نے اپنے دائیں ہاتھ سے فاروق کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کے ہاتھ نے حرکت ہی نہیں کی۔ وہ حیرت زدہ رہ گیا۔

اس کا تمام جسم ساکت تھا۔ کسی بھی حصے کو حرکت دینے کے قابل نہیں رہا

تھا۔ زبان تک حرکت نہیں کر رہی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ ہاتھوں کا بھی یہی حال ہے۔ اور نیلی کا پنجرہ اوپر اٹھنے لگا۔ یہاں تک کہ پہاڑوں سے اونچا ہو گیا۔ اس پر بھی وہ اوپر ہی اٹھتا چلا گیا۔

☆☆☆

نیلی روشنی کا سوال

"اُف خدا، ادھر تو عمودی پہاڑ ہیں اور ان پہاڑوں کے درمیان ایک وادی ہے۔" آصف نے تھرتھر کانپتی آواز میں کہا۔

"ہاں، مطلب یہ کہ ہم اس چٹیل میدان سے نکل کر پہاڑ کے اس طرف نہیں جا سکتے۔" انسپکٹر کامران مرزا ست انداز میں مسکرائے۔

"اگر یہ بات ہے تو ہم ان پہاڑوں کی مخالف سمت میں کیوں نہ چلیں۔" فرحت نے تجویز پیش کی۔

"یہ تو خیر کرنا ہی ہوگا، لیکن میرا خیال ہے، اس طرف بھی کوئی نہ کوئی رکاوٹ ضرور ہوگی۔ ہو سکتا ہے، اس طرف گہری کھائیاں ہوں، جن کا سلسلہ دور تک چلا گیا ہو اور جن میں ہم اُترنے کی جرأت بھی نہ کر سکیں۔ ان لوگوں نے ہمیں جو اس چٹیل میدان میں لا کر ڈالا ہے تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی ڈالا ہوگا۔"

"ہوں، لیکن کیا سوچ سمجھ کر۔ یہ لوگ آخر ہم سے چاہتے کیا ہیں۔"

"بہت جلد یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ کیا چاہتے ہیں، کیونکہ وہ لوگ ہماری آنکھوں سے اوجھل سہی: تاہم ہم سے دور نہیں ہوں گے۔" انسپکٹر کامران مرزا

بولے۔

"نہ ہم پارسل کی تلاش میں نکلتے، نہ ان حالات کا شکار ہوتے۔" آفتاب نے سرد آہ بھری۔

"یہ بات نہیں ہے۔ تم پارسل کی تلاش میں نہ نکلتے، تب بھی کسی نہ کسی طرح تمہیں انوار شام کے گھر ضرور لے جایا جاتا۔ یہ سب کچھ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہوا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے، جیسے ہمارے ساتھ ایک شاندار قسم کا ڈراما کھیلا گیا ہے، دوسرے لفظوں میں ہمیں بے وقوف بنایا جا رہا ہے اور وہ بھی کس طرح، ایک پارسل کا سہارا لے کر۔"

"یہ سہارا بھی کس قدر عجیب سہارا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان لوگوں کو یہ کس طرح معلوم ہو گیا کہ ہمارے نام پارسل بھیجا گیا ہے۔" فرحت نے حد درجے حیرت ظاہر کی۔

"کسی نہ کسی طرح تو انہوں نے معلوم کیا ہی ہوگا۔"

"اور ادھر محمود، فاروق اور فرزانہ ہمارے فون کا انتظار کر رہے ہوں گے۔" آصف نے چونک کر کہا۔

"ہاں بے چارے۔" آفتاب نے سرد آہ بھری۔

"وہ بے چارے یا ہم بے چارے۔ اس وقت تو ہم بیچارے بنے ہوئے ہیں۔"

"ارے۔" فرحت چونکی۔

"یہ ارے کہاں سے ٹپک پڑا۔" آفتاب نے منہ بنایا۔

اب وہ پہاڑ سے اترنے کے بعد میدان کے دوسری طرف چل پڑے تھے، تاہم اب انہیں دوڑنے کی ضرورت نہیں تھی۔ پرسکون انداز میں قدم اٹھا رہے

تھے۔ بھوک اور پیاس کا ابھی تک نام و نشان نہیں تھا، تاہم بھوک اور پیاس مٹانے کی قیمت انہیں بہت مہنگی ادا کرنا پڑی تھی۔ انہوں نے اپنے جسم سیاہ کرا لیے تھے۔

"یہ ارے میری جدید قسم کی کھوپڑی سے نکلا ہے۔" فرحت نے جھلا کر کہا۔

"لیکن، کیوں نکلا۔ یہاں اس کا کیا موقع اور کیا محل۔" آصف نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"تم تو جانتے ہی ہو آصف، میں موقع بھی دیکھنے کی عادی ہوں اور محل بھی۔" فرحت مسکرائی۔

"بالکل غلط۔ اس چٹیل میدان میں بھلا موقعے اور محل کا کیا کام؟" آفتاب نے زوردار لہجے میں کہا۔

"تم جیسوں کے لئے بے شک نہیں ہو سکتا، لیکن جو لوگ عقل استعمال کرنا جانتے ہیں، ہر جگہ موقع محل نکال لیا کرتے ہیں۔"

"ہاں تو فرحت، اب ذرا جلدی سے بتاؤ، تمہارے اس ارے کا کیا مطلب ہے۔ میں بہت بے چینی اور بے قراری سی محسوس کر رہا ہوں اور اگر تم آفتاب سے بحث میں الجھی رہیں تو اس بے چینی میں اضافہ ہی ہوتا چلا جائے گا۔" آصف نے جلدی جلدی کہا۔

انسپکٹر کامران مرزا ان کی باتیں بغور سن رہے تھے۔ انہوں نے درمیان میں دخل دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ انہوں نے سنا، فرحت کہہ رہی تھی:

"جب محمود، فاروق اور فرزانہ کو ہمارا فون نہیں ملا ہوگا تو انہوں نے آنٹی کو فون کیا ہوگا اور آنٹی نے انہیں ساری بات بتا دی ہوگی۔ یہ بھی بتا دیا ہوگا کہ ہمارے بعد انکل بھی ہماری تلاش میں کہیں گم ہو گئے ہیں اور اب تک لوٹ کر نہیں آئے۔ یہ

بات انہوں نے انکل جمشید کو سنائی ہوگی۔ وہ بھی سن کر پریشان ہو گئے ہوں گے، پھر دوسرے دن انہوں نے آئی جی کو فون کیا ہوگا، اور جب انہیں یہ معلوم ہوا ہوگا کہ ہم لوگ ابھی تک نہیں لوٹے تو وہ فوری طور پر ہماری طرف روانہ ہو گئے ہوں گے۔ انہوں نے تفتیش جی پی او سے شروع کی ہوگی۔ اس ڈاکیے کے ذریعے وہ جیب کترے تک اور جیب کترے سے انوار شاہ تک پہنچے ہوں گے۔ اور، اور میرا خیال ہے کہ ہماری ان سے بہت جلد ملاقات ہونے والی ہے۔"

"لاحول ولاقوۃ۔" آصف نے برا سا منہ بنایا۔

"کیوں، کیا ہوا؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا۔" فرحت نے اسے گھورا۔

"بھئی، یہ تو شیخ چلی کی طرح خیالی پلاؤ پکانے والی بات ہو گئی۔" آصف بولا۔

"بلکہ اس سے بھی دو ہاتھ آگے۔ شیخ چلی نے بھی اتنا بدمزہ خیالی پلاؤ نہیں پکایا ہوگا۔" آفتاب نے جھٹ کہا۔

"کیوں انکل، آپ کا کیا خیال ہے۔" فرحت نے ان دونوں کی طرف سے مایوس ہو کر رخ بدلا۔

"بھئی دونوں ہی باتیں ممکن ہیں۔ ہو سکتا ہے، وہ ہماری تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ہوں۔ اور ہو سکتا ہے، محمود، فاروق اور فرزانہ نے تمہارا فون نہ ملنے پر خود فون کیا ہی نہ ہو۔"

"چلیے مانا کہ انہوں نے فون نہیں کیا ہوگا، لیکن سرکاری ذرائع سے یا اخبارات کے ذریعے سے تو انہیں ہماری گم شدگی کا پتا چل گیا ہوگا، اور کیا وہ ہمدردی کے طور پر ہمارے گھر نہیں پہنچے ہوں گے۔ وہاں سے تمام حالات سن کر ان کا ہماری تلاش میں نکلنا عین ممکن ہے، بلکہ مجھے تو اس بات کے بہت روشن اور واضح امکانات

نظر آ رہے ہیں۔" فرحت نے پریقین لہجے میں کہا۔

"یہ اچھی بات ہے، ہمیشہ روشن امکانات کا جائزہ لینا چاہیے۔" انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

"گویا فرحت کھینچ تان کر انہیں ہماری مدد کے لیے یہاں لانے پر تل گئی ہے۔ لیکن ذرا یہ تو سوچو کہ اگر وہ بھی اس میدان میں آ پہنچے تو کیا ہمارے ساتھ خود بھی نہ پھنس کر رہ جائیں گے۔"

"تو کیا ہوا، ایک سے دو بھلے۔" فرحت مسکرائی۔

"ایک سے دو کیسے، ہم تو پہلے ہی ایک سے زائد ہیں۔ کہیں تم اچانک حساب میں کمزور تو نہیں ہو گئیں۔" آفتاب نے جل بھن کر کہا۔

"میرا مطلب تھا، ایک پارٹی سے دو پارٹیاں بھلیں۔" فرحت نے فوراً کہا اور انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

"بہر حال ہے یہ خیالی پلاؤ ہی۔" آصف بولا۔

"چلو، اگر یہ خیالی پلاؤ ہے تو تم نہ کھانا۔" فرحت نے منہ بنایا۔

"ابا جان، آخر ہمارا یہ سفر کب ختم ہوگا؟"

"پہاڑ تک جانے کے لیے ہم تقریباً چار گھنٹے تک دوڑے تھے۔ جس جگہ سے دوڑے تھے اس کے دوسری طرف نہ جانے میدان کس قدر لمبا ہے۔ لہٰذا اس طرف چلتے ہوئے تو ہم شاید کل تک ہی میدان کے دوسرے سرے تک پہنچ سکیں گے۔" انہوں نے کہا۔

"تو کیوں نہ ایک بار پھر دوڑ لگا دی جائے۔" آفتاب بولا۔

"کیا فائدہ، پہلے تو ہم ہیلی کاپٹر کے چکر میں دوڑے تھے۔"

"بھئی کم از کم تجسس تو دور ہوگا۔"

"کیوں بھئی تم کیا کہتے ہو بے ہمت۔"

"ہم آفتاب کے مقابلے میں کبھی بھی کم نہیں پڑ سکتے، لہٰذا ہم دوڑیں گے۔ اس وقت تک دوڑیں گے، جب تک کہ آفتاب تھک کر چور نہ ہو جائے اور رک نہ جائے، یا میدان کا دوسرا سرا نہ آ جائے۔" آصف نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"بالکل ٹھیک، مجھے بھی منظور ہے۔"

"اگر یہ بات ہے تو کان کھول کر سن لو۔ تم دونوں دوڑتے دوڑتے تھک جاؤ گے، تھک کر چور ہو جاؤ گے، چور ہو کر گر جاؤ گے، لیکن میں تمہیں اٹھانے کے لیے نہیں رکوں گا، دوڑتا چلا جاؤں گا۔" آفتاب نے بھی تلملائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"فکر نہ کرو، ہم تم سے مدد کی بھیک نہیں مانگیں گے۔"

"تو پھر آؤ۔"

ان کی دوڑ شروع ہو گئی۔ انسپکٹر کامران مرزا کو بھی مجبوراً ان کا ساتھ دینا پڑا۔ یہ دوڑ نہ جانے کتنی دیر جاری رہی۔ سورج بھی غروب ہو گیا۔ کوئی بھی ہار ماننے پر تیار نہیں تھا۔ انسپکٹر کامران مرزا بھی مجبوراً ان کا ساتھ دے رہے تھے۔ وہ بھی ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش نہیں کر رہے تھے۔ مقابلہ آگے نکلنے کا نہیں تھا۔ مقابلہ تھا تھکنے کا کہ پہلے کون تھکتا ہے اور ابھی یہ دوڑ نہ جانے اور کتنی دیر جاری رہتی کہ اچانک انسپکٹر کامران مرزا نے سرسراتی آواز میں ان سے کہا:

"ٹھہر جاؤ، میں آگے خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیے، تا کہ وہ آگے نہ نکل جائیں اور پھر سب سے پہلے انسپکٹر کامران مرزا سینے کے بل ریت پر لیٹ گئے۔ آفتاب، آصف اور فرحت نے بھی لیٹنے میں دیر نہ لگائی۔

☆☆

بجلی کا پتھر جوں ہی پوری طرح بلند ہوا، نیلی روشنی غائب ہو گئی۔ اس کے غائب ہوتے ہی ان کی جان میں جان آئی۔ محمود نے محسوس کیا، اب وہ اپنی زبان کو حرکت دے ہی سکتا ہے۔

"اف خدا، تیرا شکر ہے۔ میں تو سمجھا تھا کہ اب زندگی بھر حرکت نہیں کر سکوں گا۔"

"اگر تم نے حرکت کرنے کی کوشش کی تو نیلی روشنی پھر آ موجود ہو گی۔" پچھلے حصے میں آواز ابھری۔

"نہیں کریں گے حرکت، وعدہ رہا۔ مہربانی فرما کر اس روشنی کو اپنے پاس ہی رکھو۔" فاروق نے جلدی سے کہا۔

"ارے نہیں۔" فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

"کیا کہنا چاہتی ہو؟" انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر کہا۔

"میں ان سے اس نیلی روشنی کا سوال کرنا چاہتی ہوں۔" فرزانہ نے عجیب سی آواز میں کہا۔

"نیلی روشنی کا سوال، کیا مطلب؟" دوسری طرف سے چونک کر پوچھا گیا۔

"بھئی سوال کا مطلب بھی تم لوگ نہیں جانتے۔ سوال کرنا، سیدھا سادا مطلب ہے مانگنا۔" فرزانہ مسکرائی۔

"کیا مطلب؟" چونکی ہوئی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

"مطلب یہ کہ ہمیں یہ نیلی روشنی تھوڑی سی ادھار دے دو۔"

"ادھار دے دیں، یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔"

"ہاں، یہ بہت کام کی چیز ہے۔ ہمارے بھائی فاروق کی زبان کے لیے

اس سے بہتر چیز اور کیا ہو سکتی ہے۔ اگر آپ یہ ہمیں دے دیں تو ہم جب جی چاہے، اس کی زبان بند کر سکتے ہیں۔ خدا کی قسم، بہت ستاتی ہے اس کی زبان۔ بہت تیز رفتاری سے چلتی ہے اور کبھی کبھی تو ہم اس حد تک تنگ آ جاتے ہیں کہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں، لیکن زبان ہے کہ پھر بھی چلتی رہتی ہے۔" فرزانہ کہتی چلی گئی۔ انسپکٹر جمشید اور محمود بے ساختہ مسکرا رہے تھے۔ اور فاروق فرزانہ کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کھا جائے گا۔

"ہمیں افسوس ہے یہ آلہ قیدیوں کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔"

"اچھا، پھر تو مجھے بھی افسوس ہے۔" اس نے واقعی افسوس زدہ لہجے میں کہا۔

"یہ آپ ہمیں لیے کہاں جا رہے ہیں؟" محمود نے پوچھا۔

"یہ نہیں بتایا جا سکتا۔"

"اچھا چلیے، یہ تو بتا دیں کہ صدر جوناف کے ملک کا کیا بنا؟"

"اس کی فوجوں نے تو اسی شام کو ہتھیار ڈال دیے تھے۔ ہمارے یہ خبر اڑانے کی دیر تھی کہ صدر صاحب فرار ہو گئے۔ عوام پہلے ہی افراتفری کے شکار تھے، ایسے میں فوج کیا کرتی۔ اس نے فوراً ہتھیار ڈال دیے اور اب پورے ملک پر ہمارا قبضہ ہے۔"

"اوہ۔" وہ دھک سے رہ گئے۔ انہیں اپنے صدر کا خیال آ گیا تھا۔ وہ ان کے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے۔ لیکن اس میں ان کا کیا قصور تھا، وہ تو ملک سیرات پہنچ ہی نہیں سکے تھے، اگر پہنچ گئے ہوتے اور کچھ نہ کر پاتے تو اور بات تھی۔

"اب جب کہ تمہارا ملک سیرات پر قبضہ ہو گیا ہے۔ ہمیں کہاں گھسیٹے لیے پھر رہے ہو، ہمیں ہمارے ملک کی سرحد کے پاس اتار دو۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"اس عظیم شخص کا اشارا ملتے ہی ہم یہ بھی کریں گے، لیکن ابھی تک اس کی طرف سے ہمیں کوئی اشارا نہیں ملا۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"اس عظیم شخصیت کا نام کیا ہے؟"

"نام۔ نام تو نہیں بتایا جا سکتا۔"

اچانک انسپکٹر جمشید چونک اٹھے۔ انہوں نے خوف زدہ آواز میں کہا۔

"ملک سیرات پر قبضے کے بعد اب تمہاری ملک کی فوج کیا کر رہی ہے؟"

"ہاں، یہ اہم سوال پوچھا ہے تم نے، لیکن بہت دیر کے بعد۔ ہمیں تو تمہاری طرف سے اس سوال کی امید بہت پہلے تھی۔" دوسری طرف سے ہنس کر کہا گیا۔

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔" انسپکٹر جمشید فکر مند تھے۔

"فوجیں اب تمہارے ملک کی سرحدوں پر جمع ہو رہی ہیں۔"

"مجھے یہی ڈر تھا۔ ان حالات میں ہمارا اپنے ملک میں ہونا انتہائی ضروری ہے۔ اور شاید اسی لیے ہمیں اغوا کیا گیا ہے۔" انہوں نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔

"لیکن ابا جان، ایک ہمارے وہاں نہ ہونے سے کیا فرق پڑ جائے گا۔" فرزانہ نے بھی پریشان آواز میں کہا۔

"جس طرح ان لوگوں کا تنہا آدمی بڑی بڑی حکومتوں کے تختے الٹ دیتا ہے، اسی طرح ہم بھی تختوں کو الٹنے سے بچا سکتے ہیں۔ خدا نے ہمیں بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ اپنے ملک میں رہ کر ہم کم از کم اندرونی سازشوں سے تو نبٹ ہی سکتے ہیں۔ خیر کوئی بات نہیں، انسپکٹر کامران مرزا تو وہاں موجود ہی ہیں۔" انہوں نے کہا۔ اس کے باوجود ان کی آواز لرز رہی تھی۔

اچانک ہیلی کاپٹر کو ایک جھٹکا لگا۔ انہوں نے دیکھا، اب وہ اترنے لگا تھا۔

www.urdukorner.com